ہیبت ناک افسانے

مترجم
سید امتیاز علی تاج

مورس لیول
Maurice Level

ہیبت ناک افسانے

سید امتیاز علی تاج

ہیبت ناک افسانے

از

موریس لیول

مترجمہ

سید امتیاز علی تاج

سنہ ۱۹۴۳ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

بار سوم

قیمت ۱عہ ۱۲

پطرس (کیمبرج) کے نام

تمہیں خود سنانے کی آرزو

اور نہ سنا سکنے کے افسوس کے ساتھ

سید حمید علی نے امرت الیکٹرک پریس ریلوے روڈ لاہور میں باہتمام دھرم چند بھارگو بی اے، ایس

سی چھپوا کر دار الاشاعت پنجاب ریلوے روڈ لاہور سے شائع کی۔

فہرست

دیباچہ

مختصر افسانوں کی مانگ دیکھتے ہوئے اردو کے اکثر ادبی رسائل جس قسم کے طبعزاد یا مترجمہ افسانے ہر ماہ شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان کے اندراج کے جواز میں خانہ پُری کے سوا اور کوئی دلیل نہیں سوچی جا سکتی ۔

ترجمہ کے لئے عام طور پر ادب کے وہ ارزاں نمونے منتخب کئے جاتے ہیں۔ جو پست معیار کے انگریزی جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور طبعزاد افسانوں کے نام سے پریشان خیالی کا ایک نہایت بھدا اور بدنما ڈھیر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جس میں اختصار کے سوا مختصر افسانے کی اور کوئی بات نظر نہیں آتی ۔

دیباچہ

ایک دوست کا مشورہ تھا۔ کہ اردو میں مختصر افسانے کے فن پر ایک مفصل اور تعمیری تنقید کی کتاب لکھنے کی ضرورت ہے مگر میری رائے میں جب تک زبان بہترین افسانوں کے نمونوں سے آشنا نہ ہو جائے۔ اس قسم کی تصنیف قبل از وقت ہے۔

مختصر افسانے کے مطالعے کے دوران میں موپیسان کی کہانیاں اپنی کئی خصوصیات کے باعث مجھے اس قابل معلوم ہوئیں۔ کہ انہیں اردو میں منتقل کر لیا جائے۔

بعض دوسرے مصنفین کی طرح اگرچہ موپیسان کے تخیل کو بھی ہیبت و دہشت، اور تقدیر کی ستم ظریفیوں کے مضامین خاص طور پر گدگداتے ہیں لیکن انہیں یہ امتیاز حاصل ہے۔ کہ ان کے افسانے زندگی سے زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہیبت و دہشت کے اندر سے ان کے دردمند دل کی دھڑکن سنائی دیتی رہتی ہے۔ اردو ابھی تک اس قسم کی کہانیوں سے روشناس نہیں ہے۔

موپیسان بے انتہا سلیس عبارت استعمال کرتے ہیں جس کی پختگی اور روانی پڑھنے میں نظم کا سا لطف دیتی ہے۔ ایک

دیباچہ

فقرہ یا لفظ بھی ضرورت سے زیادہ یا کم نہیں ہوتا۔ مختلف چیزوں کے بیان میں تناسب کی سمجھ بے حد تیز ہے۔ چنانچہ ان کی ہر مکمل کہانی ایک نفیس اور صاف ستھرے ترشے ترشائے ہیرے کی طرح دل کش معلوم ہوتی ہے ؎

پھر ان کی کہانیاں اگرچہ عام زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن ان میں وہ خاص مقامی رنگ نہیں ہے جس کے باعث بعض مغربی شاہکار اردو میں اول تو منتقل نہیں ہو سکتے اور اگر ہوتے ہیں۔ تو پھیکے اور بے مزہ رہ جاتے ہیں ؎

ان خصوصیات کی بنا پر میں نے موسیو لیول کی کہانیوں کو اردو میں ترجمہ کرنا مناسب سمجھا ہے۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے۔ کہ ان کی کوئی خوبی ترجمہ میں برباد نہ ہونے پائے ؎

سید امتیاز علی تاج
۳۰۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء

بنک کا منیم

راوے نو دس سال سے بنک میں اس کام پر مقرر تھا کہ قرض داروں سے روپیہ وصول کرلایا کرے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا۔ اس سے کبھی کسی قسم کی وجہ شکایت پیدا نہ ہوئی تھی۔ نہ کبھی اس کے حساب کتاب میں کوئی غلطی نکلی تھی۔

تنہا زندگی بسر کرتا تھا۔ نہ نئے تعلقات پیدا کرتا نہ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں آتا جاتا۔ ہر قسم کی ترغیبات سے الگ تھلگ رہتا۔ جس حال میں تھا مگن تھا۔ کبھی کوئی کہتا۔ کہ بنک کی بڑی بڑی رقموں کا لین دین کرتے

ہوئے منہ میں پانی تو ضرور بھر آتا ہوگا" تو نہایت متانت سے جواب دیا کرتا۔ "وجہ؟ جو روپیہ اپنا نہ ہو۔ وہ روپیہ ہی نہیں"۔

جس محلے میں رہتا تھا۔ وہاں اُس کا بڑا مان تھا لوگ اکثر معاملوں میں اُس سے مشورہ لیتے۔ اور اس کی رائے پر عمل کیا کرتے تھے۔

ایک دن وہ بنک کا روپیہ وصول کرنے گیا تو شام تک گھر نہ لوٹا۔ جو لوگ اُس سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں خیانت کا تو گمان بھی نہ گذرا۔ سمجھے کوئی حادثہ ہوگیا۔ پولس نے تحقیق کرنا شروع کیا۔ کہ وہ دن میں کہاں کہاں گیا تھا۔ معلوم ہوا۔ قرض داروں کے ہاں ٹھیک وقت پر مل لے کر پہنچا تھا۔ آخری رقم موں نر و ترگیٹ کے قریب سات بجے شام کو وصول کی تھی۔ اُس وقت دو لاکھ قریب سے اوپر رقم اس کے پاس موجود تھی۔ اس کے آگے سراغ نہ ملتا تھا۔ فصیل کے قریب جو اجاڑ میدان پڑا ہے۔ اس کا چپہ

بنک کا منیم

چپہ چپہ چھان مارا۔ چھاؤنی کے آس پاس جو کھنڈر ہیں۔ اُن کا کونا کونا دیکھ ڈالا۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ کارروائی مکمل کرنے کے لئے ہر طرف۔ سرحد کے ہر اسٹیشن پر تار بھیج دیئے۔ لیکن کیا بنک کے ڈائرکٹر اور کیا پولس۔ سب کو یقین تھا۔ کہ ضرور کوئی اُچکے تاک میں بیٹھے رہے اور آتے لُوٹ کر دریا میں پھینک گئے ہیں۔ بعض معتبر اطلاعات سے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ چنانچہ سب نے قطعی طور پر یہ کہہ دیا۔ کہ بعض نامی چوروں نے ایک عرصے سے ڈاکے کا منصوبہ گانٹھ رکھا تھا۔

پیرس بھر میں ایک شخص تھا جس نے اخباروں میں یہ خیال پڑھا۔ تو مسکرا دیا... یہ راوے تو تھا۔

جس وقت پولس کے ہوشیار سے ہوشیار کھوجی سُراغ نکالنے سے رہے جا رہے تھے وہ رات کو برونی باغات میں سے ہوتا ہوا دریائے سین کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ پچھلی رات پل کی ایک محراب تلے روزمرہ کے کپڑوں کا ایک جوڑا رکھ گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر لباس تبدیل

کیا۔ دو لاکھ فرینک جیب میں ڈالے۔ وردی اور روپے کے تھیلے کی گٹھڑی سی بنائی۔ بوجھل بنانے کو ایک بھاری پتھر ساتھ باندھ دیا۔ اور دریا میں پھینک دی۔ پھر اطمینان سے پیرس لوٹ آیا۔ رات کو ایک ہوٹل میں سو رہا۔ خوب مزے کی میٹھی نیند سویا۔ چند ہی گھنٹوں میں باکمال چور بن گیا تھا۔

جب سے روپوش ہوا تھا۔ چاہتا تو ریل میں سوار ہو کر سرحد پار کر لیتا۔ مگر تھا دور اندیش۔ سمجھتا تھا سو پچاس میل نکل بھی گیا۔ تو پولس کے ہاتھوں بچ تو سکتا نہیں۔ اور پھر جو حشر ہونا ہے معلوم ہے۔ ہتھکڑی لگنے میں کچھ شبہ ہی نہیں۔ اس کے علاوہ اس نے چال بھی کچھ اور ہی سوچ رکھی تھی۔

دن چڑھا۔ تو دو لاکھ فرینک کے نوٹ ایک لفافے میں بند کئے۔ اس پر پانچ مہریں لگائیں۔ اور ایک وکیل کے ہاں پہنچا۔

کہا۔ "موسیو۔ ایک گذارش لے کر آیا ہوں۔ اس

لفافے میں چند دستاویزیں ہیں۔ انہیں کہیں حفاظت سے رکھوانا چاہتا ہوں، مَیں دور دراز کے سفر پر جا رہا ہوں۔ کون جانے کب لوٹنا ہو۔ آپ اس لفافے کو رکھ لیں۔ تو مہربانی ہو۔ اُمید ہے آپ کو کوئی عذر نہ ہوگا"۔

"کیا عذر ہو سکتا ہے۔ رسید لکھے دیتا ہوں"۔

اس نے کہا "اچھی بات"۔ پھر سوچنا شروع کیا رسید؟ رکھوں گا کہاں؟ کس کے سپرد کروں گا؟ اپنے پاس رکھی تو پونجی کی خیر نہیں۔ اس قصے کا خیال تو ابھی آیا ہی نہ تھا کچھ پس و پیش کے بعد بلا تکلف کہا:۔

"میں دنیا میں بے یار و مدد گار ہوں۔ نہ رشتہ دار ہیں نہ دوست آشنا۔ سفر خطرے سے خالی نہیں۔ کیا پتہ رسید کھو بیٹھوں یا تلف ہو جائے۔ آپ یوں نہیں کر سکتے کہ اس لفافے کو لے لیں۔ اور اپنی دوسری دستاویزوں میں حفاظت سے رکھ دیں؟ مَیں جب واپس آؤں تو آپ گویا آپ کی جگہ جو یہاں کام کر رہا ہو۔ اُسے اپنا نام بتاؤں اور اُس سے وصول کر لوں"۔

"لیکن یوں کیا تو . . ."

"آپ رسید پر یہی لکھ دیجئے۔ کہ لفافہ اس طرح طلب کرنے پر واپس کیا جائے گا۔ کچھ نقصان ہوگا تو میرا ہی ہوگا نا"۔

"آپ کی مرضی۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

بلا تامل جواب دیا۔

"دویرز رہا آزی دویرز را!"

واپس سڑک پر آیا۔ تو اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ ایک قصہ تو طے ہوا۔ اب پڑے ہتھکڑی لگاؤ۔ مال تو ہاتھ آتا نہیں۔

اس نے نہایت سکون و اطمینان سے اس تجویز پر عمل درآمد کیا تھا۔ کہ سزا کی میعاد تمام ہو چکنے کے بعد اپنا روپیہ حاصل کرلوں گا۔ اس وقت اس کا پورا حقدار ہوں گا۔ کوئی کچھ کہنے سننے کی جرأت نہ کرے گا۔ چار پانچ سال کی مصیبت ہی ہے نا۔ گذر جائے گی۔ پھر تو امیر کبیر بن جاؤں گا۔ در در پھرنے سے۔ قرض داروں

سے روپیہ وصول کرنے میں زندگی گذارنے سے تو بہت بہتر ہے۔ باقی عمر گذارنے کو دیہات میں چلا جاؤں گا۔ وہاں ہر ایک "موسیو دوبرز" کہہ کر بلایا کرے گا۔ راحت و فارغ البالی میں ضعیفی آئے گی۔ کچھ روپے سے محتاجوں معذوروں کی مدد کروں گا۔ دنیا سخی اور ایمان دار کہے گی۔

چوبیس گھنٹے اور اس بات کا انتظار کیا۔ کہ کہیں نوٹوں کے نمبر نہ نکل گئے ہوں۔ جب اطمینان ہو گیا۔ تو سگرٹ سلگا کر منہ میں دبایا۔ باہر نکل آیا۔ اور اپنے آپ کو پولس کے حوالے کر دیا۔

اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا۔ تو شاید بیٹھ کر کوئی کہانی گھڑتا۔ اس نے سوچا۔ سچ کہہ دینا۔ اور چوری کا اقرار کر لینا بہتر ہے۔ وقت کھونے سے حاصل کیا؟ لیکن جب اس پر فرد جرم لگی۔ اُس وقت۔ اور پھر جب مقدمہ چلا۔ اُس وقت بھی سب نے بہتیرا زور لگایا۔ کسی طرح اس کے منہ سے کوئی ایسا

بنک کا نیم

لفظ نکلوائیں جس سے پتہ لگ سکے۔ آخر دولاکھ ڈِنیک اس نے کٹے کیا۔ مگر بے سود۔ وہ بس یہی کہے گیا:۔
"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ایک بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ آنکھ لگ گئی۔ ۔ ۔ ۔ کسی نے لوٹ لیا"۔
وہ تو کہئے پچھلی ایمانداریاں آڑے آگئیں۔ صرف پانچ سال قید کی سزا ملی۔ ٹھنڈے دل سے فیصلہ سنتا رہا۔ پینتیس سال کی عمر تھی۔ سوچا۔ چالیس سال کا ہوجاؤں گا۔ تو آزادی بھی نصیب ہوجائے گی۔ اور دولت بھی۔ تھوڑی سی قید کی قیمت پر یہ سودا کچھ مہنگا نہ تھا۔

قید بھگتنے کے لئے جس قید خانے میں گیا سو وہاں کے قیدیوں میں اس کی فرض شناسی ویسی ہی ضرب المثل بن گئی۔ جیسی ملازمت کے دوران میں تھی۔ قید کی مدت دھیرے دھیرے گذر رہی تھی۔ بے فکری اور صبر و شکر سے گذار رہا تھا۔ بس خیال تھا تو اپنی صحت کا۔

بنک کا منیم

آخر کار رہائی کا دن آن پہنچا۔ جیل والوں کے پاس۔ اس کی جو چند چیزیں امانت کے طور پر رکھی تھیں۔ انہوں نے حوالے کیں۔ جیل سے نکلا۔ تو بس ایک ہی خیال دماغ میں گھوم رہا تھا۔ وکیل کے ہاں پہنچا جا رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ وہاں کیا گذرے گی:۔

پہنچوں گا۔ ملازم آراستہ پیراستہ دفتر میں لے جائے گا۔ وکیل کو میں کیا یاد رہا ہوں گا۔ عینک لگائے گھور گھور کر دیکھے گا۔ اچھی خاصی مدت گذر گئی ہے۔ عمر ڈھل چکی۔ مصیبتوں نے چہرہ بدل ڈالا۔ وکیل بھلا کہاں پہچان سکے گا؟ ہا! ہا! ویسے ہی ملاقات دلچسپ رہتی۔ وکیل کی بھول سے لطف دوبالا ہو جائے گا۔

"فرمایئے موسیو کیسے تشریف لانا ہوا؟"

"پانچ سال ہوئے۔ میں نے آپ کے پاس ایک امانت رکھوائی تھی۔ وہ لینے آیا ہوں"۔

"کونسی امانت؟ کس نام سے رکھوائی تھی؟"

"کس نام سے۔ موسیو۔ ۔ ۔"

رادے تو رُک گیا۔ یک لخت کچھ منہ ہی منہ میں کہنے لگا:۔

"ارے واہ۔ یاد نہیں آتا۔ کیا نام بتایا تھا؟"

دماغ پر طرح طرح سے زور دیا۔ کچھ نہیں! بنچ رکھی تھی۔ اس پر بیٹھ گیا۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑے جا رہے تھے۔ دل کو ڈھارس دلائی۔ اپنے آپ کو سمجھانے لگا:۔

"گھبرانے کی کیا بات ہے! دل جمعی سے سوچو! موسیو۔ موسیو . . . اچھا بھلا پہلا حرف کیا تھا؟"

گھنٹہ بھر تک فکر میں کھویا ہوا بیٹھا رہا۔ حافظے سے بہتیرا کام لینا چاہا۔ خیال ہی خیال میں اِدھر اُدھر بہت ہاتھ پیر مارے۔ شاید کوئی ایسی بات یاد آجائے جس سے نام کا سُراغ مل سکے۔ بے سود۔ نام جیسے اس کی نظروں کے سامنے۔ اس کے ارد گرد ناچ رہا ہے۔ حرف اُچھل اُچھل کر سامنے آتے نظر پڑتے۔ لفظ غائب ہو جاتا۔ بار بار ایسا معلوم ہوتا۔ یاد آگیا۔ آنکھوں کے سامنے لکھا ہے۔

زبان پر موجود ہے۔ نہ! پہلے پہلے تو کچھ جھنجھلا کر رہ جاتا۔ رفتہ رفتہ ناکامی کا احساس تیز ہوتا گیا۔ نشتر سا بن گیا۔ جو گویا دل میں اُترا جا رہا تھا۔ تلملائے دیتا تھا۔ کمر پر گرم گرم لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ عضلات سکڑے جاتے تھے۔ اطمینان سے بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ ہاتھوں کی اُنگلیاں مُڑنی شروع ہوئیں۔ زور سے مُٹھی بند کر لی۔ خشک ہونٹوں میں دانت گاڑ دیئے۔ کبھی بے اختیار چاہتا رو دے۔ کبھی ولولہ اُٹھتا۔ کسی سے لڑ پڑے۔ جتنی کوشش کرتا کہ توجہ کو سمیٹ سماٹ کر ایک جگہ جمع کرے۔ اتنا ہی نام زیادہ دور جاتا ہوا معلوم ہوتا۔ زمین پر زور زور سے پاؤں مارے۔ اُٹھ کھڑا ہوا۔ آخر بلند آواز سے بولا:۔

" اب اس پریشانی سے کیا حاصل؟ یوں تو نام یاد آتا بھی ہو گا۔ تو بھول جاؤں گا۔ خیال چھوڑ دیا۔ تو خود بخود یاد آجائے گا"۔

مگر جس چیز نے دل اور دماغ کو گھیر رکھا ہو۔ اس سے اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔

راہ چلتوں کے چہروں پر توجہ کرنی چاہی ۔ دُکانوں کی کھڑکیوں میں چیزیں دیکھ کر تھم گیا بازاروں کے شور و غل پر کان لگائے لیکن جب کچھ سُن رہا ہوتا تو بغیر سنے کچھ دیکھ رہا ہوتا ۔ تو بغیر نظر آئے ۔ وہ عظیم سوال بدستور ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہوا تھا :

" موسیو ؟ موسیو ؟ "

رات پڑ گئی ۔ گلی کوچے سنسان ہو گئے ۔ تھکن سے چُور چُور ہو رہا تھا ۔ ایک ہوٹل میں چلا گیا ۔ ایک کمرہ لے لیا ۔ اُسی طرح تمام کپڑے پہنے پہنائے بستر پر پڑا رہا ۔ گھنٹوں دماغ کا دفتر اُلٹ پلٹ کرتا رہا ۔ صبح کے قریب نیند آ گئی ۔ آنکھ کھلی تو دن اچھا خاصا چڑھ چکا تھا طبیعت شگفتہ تھی ۔ بڑے مزے میں انگڑائی لی لیکن پلک جھپکتے میں پھر اُسی خیال نے دماغ میں پنجے گاڑ دیئے

" موسیو ؟ موسیو ؟ "

دماغ کرب میں تو مبتلا تھا ہی ۔ کوڑھ پر کھاج ایک نیا احساس پیدا ہُوا ۔ ڈر ۔ یہ ڈر کہ کیا پتہ یہ نام کبھی

یاد ہی نہ آئے۔ اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر نکل گیا۔ جدھر منہ اٹھا ادھر چل دیا۔ گھنٹوں یونہی پھرتا رہا۔ وکیل کے مکان کے گرد چکر لگایا کیا۔ اگلی رات آ گئی۔ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ کر درد بھری آواز میں بولا:-

"میرا سر پھٹ جائے گا"۔

اب ایک بھیانک خیال نے اُس کے دماغ پر قابو پالیا۔ میرے پاس دو لاکھ فرینک نوٹوں میں ہیں۔ بے ایمانی سے آئے سہی۔ ہیں تو میرے۔ اور میں انہیں نہیں لے سکتا۔ ان کے پیچھے پانچ سال کی قید بھگتی۔ اور اب انہیں چھو نہیں سکتا۔ نوٹ میری راہ تک رہے ہیں۔ ایک لفظ صرف ایک لفظ۔ جو یاد نہیں آتا۔ مجھ میں اور اُن میں دیوار بن گیا ہے۔ اس دیوار کو میں پھلانگ نہیں سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ہوش حواس قابو سے نکلے جا رہے ہیں۔ مٹھیاں بھینچ کر زور زور سے سر پر ماریں شرابیوں کی طرح لڑکھڑا کر لمپ کے کھمبے سے ٹکر کھائی راستہ چلنے کی پٹڑی سے نیچے اُتر گیا۔ اب یہ صورت

نہ رہی تھی۔ کہ سوال نے دماغ کو گھیر رکھا ہو۔ اب تو یہ سوال اُس کی تمام ہستی میں۔ اس کے دماغ میں۔ اس کے گوشت پوست تک میں ایک جنون بن کر سما گیا تھا۔ یقین ہو گیا تھا۔ اب نام کبھی یاد نہ آئے گا۔ کسی سحر نے ایک قہقہہ پیدا کر دیا تھا۔ جو اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ وہ گذرتا تو راہ گیر اس پر اُنگلیاں اُٹھاتے تھے۔ وہ چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ خود بخود تیز چلنے لگا۔ اور تیز چلا۔ دوڑ پڑا۔ سیدھا بھاگا چلا جا رہا تھا۔ آمد و رفت کا خیال ہی نہ تھا۔ آنے جانے والوں سے ٹکریں کھا رہا تھا۔ چاہتا تھا۔ ٹکر کھا کر گر پڑوں۔ روندا جاؤں دنیا سے میرا نشان مٹ جائے۔

"موسیو؟ موسیو؟"

پاس ہی سامنے سین بہ رہا تھا۔ اس کے سبزی مائل گدلے پانی پر چمکتے تاروں کا عکس پڑ رہا تھا۔ اس نے سسکیاں بھر کر کہا:۔

"موسیو . . . ؟ ہائے رے وہ نام میرے اللہ

وہ نام!"

گھاٹ کی سیڑھیاں اُتر کر دریا کے کنارے پر چلا گیا۔ اوندھا لیٹ گیا۔ سرک کر عین کنارے پر پہنچا کہ پانی سے ہاتھ منہ ٹھنڈا کرے۔ سانس پھول رہا تھا۔ دریا کا پانی اُسے کھینچ رہا تھا . . . اس کی گرم آنکھوں کو کھینچ رہا تھا . . . اس کے کانوں کو . . . اس کے تمام جسم کو کھینچ رہا تھا ۔ اُسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے میں پھسل رہا ہوں۔ کنارے کی ڈھلان پر سنبھل نہ سکا۔ گر پڑا ۔ اچانک ٹھنڈے یخ پانی میں گرنے سے اعصاب میں سنسنی سی دوڑ گئی بہتیری کشمکش کی . . . ہاتھ پاؤں مارے . . . پانی میں سے سر نکالا . . . نیچے چلا گیا . . . پھر سطح پر آیا۔ یک لخت بے انتہا کوشش سے چلایا۔ آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں ۔

"یاد آگیا . . . بچانا! دُودیر۔ ذرا دُودیر . . ."

گھاٹ سنسان تھا۔ بہکتا ہوا پانی پل کے

پایوں سے ٹکرا کر بہا چلا جا رہا تھا۔ اس سناٹے میں پل کی اندھیری محراب میں گونج نے نام کو دُھرایا ۔ . . دریا دھیرے دھیرے جیسے اُٹھتا اور گر پڑتا تھا۔ سفید اور سُرخ روشنیاں اس کی سطح پر ناچ رہی تھیں۔ ایک لہر جو دوسری لہروں سے کسی قدر بڑی تھی۔ لنگروں کے بھاری بھاری کڑوں کے قریب ساحل سے ٹکرائی ۔ . . پھر ہر چیز پر سکون چھا گیا . . .

کون؟...

اس روز مَیں بہت دیر تک کام کرتا رہا تھا
اتنی دیر تک۔ کہ آخر کار جب مَیں نے میز پر سے نظریں
اُٹھائیں تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ شفق شام سے میرا مطالعہ
کا کمرہ لالہ زار بن رہا ہے۔ ذرا دیر تک میں بے حس و
حرکت بیٹھا رہا۔ دماغ پر کسل کی وہ کیفیت طاری
تھی۔ جو کسی بڑی ذہنی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بے
تعلق نظروں سے اِدھر اُدھر تکتا رہا۔ مدھم روشنی
میں ہر چیز دُھندلی دُھندلی اور بے وضع سی نظر آ
رہی تھی۔ اگر کچھ روشنی تھی۔ تو ان جگہوں پر جہاں

کون؟ ۔ ۔ ۔

غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں میز ۔ آئینے اور تصویر پر سے منعکس ہو کر روشنی کے دھبے ڈال رہی تھیں ۔ کتابوں کی الماری پر ایک انسانی کھوپری رکھی تھی ۔ اس پر شعاعیں ضرور خاص قوت سے منعکس ہو کر پڑ رہی ہوں گی ۔ کیونکہ میں نے نظریں اُٹھائیں تو وہ مجھے ایسے روشن طور پر نظر آئی ۔ کہ گال کی ہڈی سے لے کر جبڑے کے زبردست زاویئے تک ہر حصّہ بخوبی واضح تھا ۔ شام کا دُھندلکا بڑی سرعت سے گہرا ہوتا جا رہا تھا ۔ اور ہر چیز کو جیسے نگلے لے رہا تھا ۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوُا ۔ کہ رفتہ رفتہ مگر قطعی طور پر اس سر میں زندگی کی چنگاری چمک اُٹھی ہے ۔ وُہ گوشت پوست سے منڈھا گیا ہے ۔ دانتوں پر ہونٹ سرک آئے ہیں حلقوں میں آنکھیں جڑ سی گئی ہیں ۔ بہت جلد کسی انوکھے سحر سے مجھے ایسا نظر آنے لگا ۔ کہ میرے سامنے تاریکی میں گویا ایک سر معلق ہے ۔ اور میری طرف تک رہا ہے ۔

کون؟ . . .

وہ سر جھی ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔
اور اُس کے چہرے پر استہزا کا ایک تبسّم تھا۔ یہ کوئی اس قسم کا گریز یا تصور نہ تھا۔ جو انسان کا تخیل پیدا کر لیا کرتا ہے۔ یہ چہرہ ایسی حقیقی چیز معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک مرتبہ تو میں بے قرار ہو گیا۔ کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھُولوں لیکن یک لخت رخسار جیسے تحلیل ہو کر رہ گئے۔ حلقے خالی ہو گئے۔ ایک ہلکی سی کُہر نے اُسے ملفوف کر لیا . . . اور پھر مجھے عام کھوپریوں کی طرح ایک کھوپری نظر آنے لگی
میں نے چراغ روشن کیا۔ اور پھر اپنی تحریر کے کام میں مصرُوف ہو گیا۔ دو تین بار میں نے نظریں اُٹھا کر اُس مقام کو دیکھا۔ جہاں یہ رُوح مجھے نظر آئی تھی۔ اس کو دیکھ کر جو عارضی اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ وُہ جب دور ہو گیا۔ تو میں سر جُھکا کر اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ اور اس کے متعلق سب کچھ بھُول گیا۔
اب کیا ہُوا۔ کہ چند روز بعد میں گھر سے کہیں جا رہا تھا۔ تو راہ میں ایک نوجوان سے دوچار ہُوا۔

کون؟ . . .

مجھے گذرنے کو راہ دینے کے لئے وہ ایک طرف کو
ہٹ گیا۔ مَیں نے شکریئے کے طور پر سر جھکایا +
اس نے بھی یونہی کیا۔ اور اپنی راہ چل دیا + پر اس
کا چہرہ مجھے کچھ مانوس سا معلوم ہُوا + یہ سمجھ کر کہ مَیں
اس سے صورت آشنا ہوں۔ مَیں نے مُڑ کر اس کی
طرف دیکھا۔ خیال تھا کہ شاید وہ بھی رُک گیا ہو ۔
لیکن وُہ نہ رُکا تھا + مَیں کھڑا اس کو تکتا رہا۔ یہاں
تک کہ راہ گیروں کے درمیان وہ نظر سے اوجھل
ہو گیا + مَیں نے جی میں کہا "یونہی مغالطہ ہُوا ۔" پر
اچنبھے کی بات یہ تھی ۔ کہ بار بار دل میں سوال پیدا
ہوتا تھا "آخر مَیں نے اسے دیکھا ہے تو کس جگہ ؟"
. . . کسی کے ڈرائنگ روم میں ؟ . . . ہسپتال
میں ؟ . . . اپنے مطب میں ؟ . . . نہیں . . .
آخر نتیجہ یہ نکالا ۔ کہ ضرور کسی اَور شخص سے مشابہ ہے
اور یہ سوچ کر اس کا خیال دل سے نکال ڈالا ۔ یا
یوں کہئے ۔ کہ خیال کو دل سے نکال دینے کی کوشش

کی۔ کیونکہ باوجود اس ارادے کے بھی میں بار بار اس کا سُراغ نکالنے ہی کی فکر میں رہا۔ میں قطعی اس کی صورت سے آشنا تھا۔ گہری جڑی ہوئی آنکھیں ٹکی ہوئی نظریں۔ مُنڈی ہوئی مونچھیں۔ سیدھا دہانہ۔ اور مضبوط جبڑے ایسی نمایاں خصوصیات تھیں۔ کہ نہ دل سے محو ہو سکتی تھیں۔ اور نہ ان کا کسی دوسرے شخص پر التباس ہو سکتا تھا۔ الٰہی میں نے اسے دیکھا تو کہاں دیکھا ہے؟ ساری شام اس کا خیال میرے دامنگیر رہا۔ جس چیز پر بھی نظر ڈالتا۔ میرے اور اس کے درمیان آن موجود ہوتا۔ اور برافروختگی کا ایسا احساس مجھ میں پیدا کر دیتا۔ جیسا کسی نام یا گیت کے زبان پر پھرنے اور یاد نہ آنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت عرصے تک۔ ہفتوں تک جاری رہی۔

ایک دن سڑک پر پھر یہی نامعلوم شخص مجھے نظر پڑ گیا۔ میں اس کے قریب پہنچا۔ تو یہ کیفیت تھی۔ کہ تقریباً اسے گھور رہا تھا۔ وہ بھی میری طرف

تک رہا تھا۔ اُسی سرد مہری اور انہیں ٹکی ہوئی نظروں
سے تک رہا تھا۔ جن سے مَیں بخوبی واقف تھا۔ لیکن
اس کے چہرے سے کوئی ایسے آثار ظاہر نہ ہوئے جن
سے یہ معلوم ہوتا۔ کہ وہ مجھے جانتا ہے۔ وہ پل بھر کے
لئے بھی نہ رُکا۔ اور یک لخت دائیں ہاتھ مُڑ کر مجھ سے
کترا گیا۔ اب جو نتیجہ نکلنے کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔
مَیں نے نکال لیا۔ کہ اگر مَیں اس سے واقعی واقف ہوتا
تو وہ بھی ضرور مجھ سے واقف ہوتا۔ اور یوں دوسری
مرتبہ آمنے سامنے آجانے کے بعد وہ نظر دل ہی نظروں
میں یا رُک جانے کا اشارہ کر کے تعلقات کا اظہار کرتا
لیکن چونکہ ان باتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہوئی۔
لہذا مجھے قطعی غلط فہمی ہوئی ہے۔

اس کے بعد مَیں اُس شخص کے متعلق سب
کچھ بھول گیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد۔ ایک روز سہ پہر کے
وقت ملازم ایک شخص کو میرے مطب میں لے کر آیا

وہ بہ مشکل دہلیز پر سے گذرا ہو گا ۔ کہ بے انتہا حیرت کے عالم میں مَیں اس کے خیر مقدم کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا ۔ یہ میرا وہی نامعلوم شخص تھا ۔ جس مشابہت نے اتنے عرصے مجھے پریشان کئے رکھا تھا ۔ ایک مرتبہ پھر اس قدر نمایاں معلوم ہوئی ۔ کہ مَیں ہاتھ بڑھا کر یوں اس کی طرف چلا ۔ گویا وہ میرا آشنا سا ہے ۔ وہ کچھ متحیر سا معلوم ہُوا ۔ مَیں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا ۔ اور تقریباً لڑکھڑاتی زبان میں بولا:

" معاف کیجئے گا ۔ آپ کی مشابہت ایسے حیرت انگیز طور پر ۔ ۔ ۔"

وہ تیز اور رُکی ہوئی نظروں سے مجھے تک رہا تھا ۔ ان کے رُعب سے مَیں نے اپنا فقرہ نا تمام چھوڑ دیا ۔ اور اس کے بدلے کہا:

" مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

وہ بے حس و حرکت بیٹھا ہُوا تھا ۔ ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر رکھے ہوئے تھے ۔ جواب میں فوراً

کچھ نہ بولا۔ اُدھر مَیں پھر یہ دماغ کاوی شروع کرنے ہی کو تھا: "کہ مَیں نے اسے کہاں دیکھا ہے"۔ جو ایک خیال یا یوں کہیے۔ کہ ایک انوکھا تصوّر بجلی کی طرح میرے دماغ میں یک بخت چمک اُٹھا۔ اتنا حیرت ناک تصوّر کہ مَیں اچنبھے کے عالم میں چلا اُٹھا۔ "مَیں جانتا ہوں"۔ آخر مَیں نے اس کا پتہ چلا ہی لیا۔ اس زندہ آدمی کے شانوں پر مَیں نے اس سر کو پہچان لیا تھا۔ جو ایک روز شام کو تاریکی میں۔ مجھے کتابوں کی الماری پر دکھائی دیا تھا۔ دونوں میں مشابہت ہی نہ تھی۔ دونوں چہرے قطعی ایک تھے۔ مطابقت اتنی عجیب و غریب تھی۔ کہ اس کے خیال میں مَیں کچھ نہ سن سکا۔ کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ چنانچہ اس کے کچھ دیر تک باتیں کر چکنے کے بعد مَیں نے اس کے معاملے کو سننا شروع کیا۔

". . . میرا خیال ہے۔ کہ میری حالت کبھی معمولی انسانوں کی سی نہ تھی۔ بچہ ہی تھا۔ تو میرے

احساسات دوسرے لڑکوں سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ یک لخت جی چاہتا۔ کہیں بھاگ جاؤں کہیں چھُپ جاؤں۔ اکیلا رہ جاؤں۔ بعض وقت بے اختیار دل میں یہ ارمان شدّت سے پیدا ہوتا۔ کہ مجمعوں میں رہوں۔ ایسی وحشیانہ لذّتوں سے لطف اندوز ہوں۔ کہ اپنے آپ کو بھُول جاؤں۔ کئی مرتبہ کسی وجہ سے یا بلا وجہ اچانک اتنے غصّے اور جوش میں آجاتا کہ سُدھ بدھ نہ رہتی . . . مجھے سمندر کے کنارے بھیجا گیا۔ پہاڑوں پر بھیجا گیا۔ پر کسی طرح افاقہ نہ ہُوا۔ اب یہ حالت ہے کہ ذرا سے کھٹکے سے چونک اُٹھتا ہوں۔ تیز روشنی سے مجھے دُکھ کی سی تکلیف ہوتی ہے۔ کئی ڈاکٹروں کے پاس جا چکا ہوں۔ ویسے سب اعضاء درست ہیں۔ پر میرا سارا جسم دُکھتا رہتا ہے۔ سوتا بھی ہوں۔ تو صبح کو ایسا تھکا ہارا اُٹھتا ہوں۔ گویا تمام رات لہو و لعب میں گذری ہے۔ اکثر اوقات ایک ذہنی کرب کی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس کی کوئی وجہ سمجھ

ییں نہیں آتی۔ پر اس سے میرا سر گھومنے لگتا ہے۔ سو نہیں سکتا۔ سوتا ہوں تو بھیانک خواب ستانا شروع کر دیتے ہیں۔ ۔ ۔"

"آپ شراب تو نہیں پیتے؟"

"مجھے شراب سے اور الکحل کی ہر قسم سے گھن ہے پانی کے سوا کچھ نہیں پیتا۔ پر ابھی بدترین بات میں نے آپ کو نہیں بتائی۔ ۔ ۔ وہ کیا شے ہے۔ جو واقعی مجھے اپنے متعلق اندیشہ ناک معلوم ہوتی ہے۔ ۔ ۔ کوئی میری ذرا سی بات کی۔ ایک نگاہ کی۔ ایک اشارے کی۔ کسی ہی چیز کی ایک دفعہ تردید کر دے۔ تو یک لخت مجھ پر غیظ و غضب کا جنون سا طاری ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسلح پاس نہ رکھنے میں بڑا محتاط رہتا ہوں۔ کسی ایسے ہی موقع پر شاید ان کو کام میں لانے کی ترغیب پر غالب نہ آسکوں + ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان اوقات میں میری قوت ارادی میرا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ گویا کسی اَور کی قوت ارادی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ بس وہ

مجھے اُکسا کر بڑھائے لئے جاتی ہے۔ مجھے اپنے اوپر قابو
نہیں رہتا۔ اور پھر جب میں اپنے آپے میں آتا ہوں۔
تو مجھے اس کے سوا اور کچھ یاد نہیں ہوتا۔ کہ میں کسی کو
مار ڈالنا چاہتا تھا! اگر گھر پر موجود ہوں۔ اور اس قسم
کی نازک حالت مجھ پر قابو پا جائے۔ تب تو میں اپنے
کمرے کو بند کر کے اندر محفوظ بیٹھ سکتا ہوں۔ پر بعض
اوقات ایسا اتفاق ہوتا ہے۔ کہ میں گھر سے باہر ہوتا ہوں
اس وقت مجھے کچھ خبر نہیں ہونے پاتی۔ کہ کیا گذری +
بس معلوم ہوتا ہے تو اتنا۔ کہ بعض اوقات رات کے
وقت کسی انوکھے مقام میں بنچ پر اکیلا بیٹھا ہوا ہوں +
پھر مجھے غیظ و غضب کی وہ کیفیت یاد آتی ہے۔ جو محسوس
ہوئی تھی۔ بعد کی تھکن کو اس سے منسوب کر لیتا ہوں
یہ تو کسی طرح یاد آتا نہیں۔ کہ کیا کیا تھا۔ چنانچہ دل ہی
دل میں حیران ہونے لگتا ہوں۔ کہ کوئی جرم تو نہیں کر
بیٹھا + دوڑا ہوا۔ گھر پہنچتا ہوں۔ اور دروازے بند
کر کے بیٹھ رہتا ہوں۔ جہاں کسی نے گھنٹی بجائی۔ میرا

دل زور سے دھک دھک کرنا شروع کر دیتا ہے۔ دلوں سکون قلب نصیب نہیں ہونے پاتا۔ اس کے بعد کہیں یہ یقین آتا ہے۔ کہ ایک مرتبہ پھر اپنے ہاتھوں آپ بچ نکلا ہوں ۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ صورت حالات ایسی نہیں۔ کہ اس کی فکر نہ کی جائے اس سے نہ صرف میری صحت بگڑ جائے گی۔ بلکہ ہوش حواس بھی بس میں نہ رہیں گے . . . اب میں کروں تو کیا کروں؟"

میں نے جواب دیا" یہ کوئی ایسی خطرے کی بات نہیں۔ صرف عصبی کمزوری کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ علاج سے دور ہو جائے گی۔ چنانچہ اس کے اسباب دریافت کرنے چاہئیں۔ آپ بہت زیادہ محنت کرتے ہیں؟ . . . نہیں . . . آپ کی زندگی میں کوئی ایسی بات گذری ہے۔ جس سے اعصاب پر خاص اثر پڑ سکتا ہو؟ . . . نہیں . . . کوئی بے اعتدالی؟ . . . کوئی نہیں . . . ڈاکٹروں سے کسی قسم کا حجاب نہیں ہونا

چاہئے ۔۔۔"

وہ بولا "میں نے سب کچھ من و عن بیان کر دیا ہے"۔

اور اس کی آواز اعتماد انگیز تھی۔

"تو پھر دوسرے اسباب پر غور کرنا چاہئے۔ آپ کے کوئی بھائی بہن ہے؟ ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ آپ کی والدہ زندہ ہیں؟ ۔۔۔ ہیں ۔۔۔ ان کو بھی غالباً کمزوریٔ اعصاب کی شکایت ہوگی؟ ۔۔۔ بالکل نہیں ۔۔۔ اور آپ کے والد؟ ۔۔۔ وہ بھی خوب تندرست و توانا ہیں؟"

بڑی ہلکی آواز میں اس نے جواب دیا:

"میرے والد مر چکے ہیں"۔

"جوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا؟"

"جی ہاں۔ میں اس وقت صرف دو سال کا ہوں گا"۔

"کچھ معلوم ہے کس مرض سے انتقال ہوا تھا؟"

معلوم ہوتا تھا۔ اس سوال کا اس پر بہت زیادہ

اثر ہوا ہے۔ کیونکہ اس کا رنگ بالکل پیلا پڑ گیا۔ اس وقت مجھے ہمیشہ سے زیادہ واضح طور پر اس کی اور اس چہرے کی جو مجھے دکھائی دیا تھا۔ مشابہت معلوم ہوئی۔ ذرا سے توقف کے بعد اس نے جواب دیا:

"جی ہاں . . . اور اسی باعث میں اپنی حالت سے خائف ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ میرے باپ کا انتقال کیونکر ہوا تھا۔ وہ گلوٹین پر مارے گئے تھے۔"

مجھے بڑا ہی افسوس ہوا۔ کہ خواہ مخواہ تحقیق کرتا کرتا یہاں تک پوچھ بیٹھا۔ چاہا کہ اب یہ قصہ ٹلا کر کوئی اور تذکرہ چھیڑ دوں۔ پر اب دو تو ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ چکے تھے۔ میں نے ایسی باتیں کرنے کی کوشش کی۔ جن سے میرے اس احساس کا پتہ نہ چلنے پائے۔ اور مریض کے دل میں امید پیدا ہو۔ ساتھ ہی اُسے بعض ضروری ہدایات دیں۔ نسخہ بھی لکھ دیا۔ اور کہا کہ اپنے اوپر اعتماد رکھنا۔ گھبرانا نہیں۔ اور جلد ہی پھر مجھ سے ملنے کو آنا۔ جب میں اسے پہنچانے دروازے

تک گیا۔ تو مَیں نے ملازم سے کہا:

"آج مَیں اَور کسی شخص سے ملاقات نہ کروں گا"

میری حالت ایسی نہ تھی۔ کہ کسی مریض کا حال

سُن سکتا یا اس کا معائنہ کرتا، دماغ اُلجھ رہا تھا . . .

وہ سر جو دکھائی دیا تھا . . . اُس کی مشابہت . . .

پھر یہ اعتراف . . . مَیں بیٹھ گیا۔ اور اپنے خیالات کو

مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ذرا سی دیر میں محسوس

ہوا۔ کہ بار بار نظریں آپ سے آپ اُٹھ کر کھوپری پر جم

رہی ہیں۔ بہتیری کوشش کی۔ کہ پھر وہ انوکھی مشابہت

نظر آ جائے۔ جس نے اتنے عرصے پریشان کئے رکھا تھا

پر اس کے پُر اسرار نقاب کے سوا اَور کچھ نظر نہ آیا+ پھر

بھی مَیں اپنی نظریں اس پر سے نہ ہٹا سکا۔ سر۔ مجھے

کھینچ رہا تھا۔ اس نے مجھے جکڑ رکھا تھا . . . انجام کار

میں کرسی پر سے اٹھا۔ اور جا کر الماری پر سے اُسے اُتار لیا

اس وقت مَیں نے اُسے ہاتھوں میں جو اُٹھایا

تو مجھے ایک غیر معمولی چیز نظر آئی۔ جو اب تک میری نظر

سے بچی ہوئی تھی۔ گدی پر ایک چوڑا اچکلا اور گہرا نشان تھا جیسے کسی نے زور سے کلہاڑا مارا ہو۔ یا جیسے گلوٹین پر سر قلم ہوا ہو۔ اور اس عظیم لمحے میں جبکہ گلوٹین کا پھل گردن پر آ کر پڑتا ہے۔ مقتول کا جسم فطرت کے تقاضے سے ڈر کے مارے ذرا پیچھے کو سرک گیا ہو۔

ممکن ہے۔ یہ محض اتفاق ہو۔ یا شاید اس کی یوں توجیح کر دی جائے۔ کہ میں نے بے دھیانی میں اپنے اس مریض کا چہرہ پہلے کہیں راستے میں دیکھ لیا تھا۔ اور اس طرح جو نقش تحت الشعور میں آ کر میرے ذہن میں رہ گئے تھے۔ اس رات نظروں کے سامنے آ گئے۔ جب میں کھوپڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے سر دکھائی دیا تھا . . . شاید یوں ہی ہو . . . شاید؟ . . . لیکن آپ کو علم ہے۔ کہ کئی اسرار ایسے ہیں۔ جن کو حل کرنے کی کوشش نہ کرنا ہی دانشمندی ہے ❊

ٹھاٹھ...

ٹھنڈ کے مارے پنڈا نیلا پڑا ہوا تھا۔ اس روز
صبح کو گاڑیوں کے دروازے کھولنے اور بند کرنے
کی خدمت کر کے جو چند پیسے کمائے تھے۔ جیب میں
ہاتھ ڈال کر۔ انہیں مٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔ سرد ہوا
جیسے کاٹے کھا رہی تھی۔ جھونکوں سے بچنے کے لئے
سر کو کندھے پر جھکا رکھا تھا۔ اور یوں تیز گام اژدہام
میں فقیر چلا جا رہا تھا۔ اتنا تھک چکا تھا کہ کسی کو
مخاطب کرنے کی سکت نہ رہی تھی۔ اتنا ٹھٹھر گیا تھا
کہ بھیک مانگنے کو ہاتھ جیب سے نکالنا دوبھر تھا۔

ٹھاٹھ . . .

برف روئی کے گالوں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑ
رہی تھی۔ کبھی اس کی ڈاڑھی میں اُلجھ جاتی کبھی گردن پر
پگھل جاتی + اُسے اِس کا خیال بھی نہ تھا۔ اپنے ہی
خوابوں میں کھویا ہوا تھا:

"کہیں میں امیر ہو جاتا۔ بس اک گھنٹہ بھر کے
لئے . . . تو میرے پاس گاڑی ہوتی . . ."

تھم گیا۔ پل بھر کچھ سوچا۔ سر ہلا دیا۔ اپنے آپ
سے پوچھنے لگا:

"اَوْر اَوْر کیا ہوتا؟ . . ."

تنعم کے مختلف تصوّرات دماغ میں سے گذر
گئے۔ پر ہر بار جب کوئی آرزو بنا لیتا۔ تو نا تسلّی بخش انداز
سے بازو جھٹک دیتا۔

"یوں تو کچھ بھی نہیں . . . پھر کیا سچی خوشی کا
ایک پل حاصل کرنا بھی اتنا کٹھن ہے . . ."

. . . یوں ہی گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا۔ کہ دیکھا
ایک دوسرا فقیر ایک مکان کی پچھلے دار ڈیوڑھی میں

بیٹھا سردی سے کانپ رہا ہے۔ چہرے پر حسرت برس رہی ہے۔ ہاتھ پھیلا رکھے ہیں۔ یکساں آواز سے دھیرے دھیرے صدا لگا رہا ہے۔ مگر آواز اس قدر کمزور ہے کہ بازار کے شور و غوغا میں معلوم بھی نہیں ہوتی:

"لوگو راہِ مولا کچھ دیتے جاؤ . . . کچھ بخشتے جاؤ . . ."

پاس ہی ایک کتا بیٹھا ہے مسکین سا۔ مٹی میں لت پت۔ دُم ہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور ناتواں آواز میں بھونکتا ہے۔ تو آپ ہی آپ کانپ اُٹھتا ہے فقیر تھم گیا۔ اس دوسرے صید آلام کو دیکھ کر کُتا اس سے ناک رگڑنے لگا۔ اور ذرا زور سے بھونکا۔

فقیر غور سے اندھے کو دیکھتا رہا۔ کہ چیتھڑے پہن رکھے ہیں۔ پھٹے پُرانے جُوتے ہیں۔ ہاتھ ٹھنڈ کے مارے نیلے پڑ گئے ہیں۔ چہرہ حسرت ناک اور بے روح سا ہے۔ جس پر بند آنکھیں ہیں سینے پر ایک خنائی اشتہار ہے۔ جس پر صرف ایک لفظ "اندھا" لکھا ہے۔

اندھے نے یہ محسوس کر کے کہ اس کے سامنے کوئی رُک گیا ہے۔ پھر اپنی فریادی صدا لگانی شروع کر دی:

"حضور مدد کیجئے . . . دُکھی اندھے پر رحم فرمایئے . . . "

فقیر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ آنے جانے والے وہاں پہنچ کر تیز قدم اُٹھانے لگتے۔ اور منہ موڑ کر نکل جاتے۔ ڈیوڑھی میں سے ایک عورت نکلی۔ پوستین سے لدی ہوئی تھی۔ باوردی ملازم نے اس کے سر پہ چھتری لگا رکھی تھی۔ خود اس نے ایک سمور سے اپنا چہرہ محفوظ کر رکھا تھا۔ پنجوں کے بل چل کر گاڑی تک پہنچی۔ اور اس میں سوار ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اندھا اپنی یکساں آواز میں مسلسل فریاد کئے جا رہا تھا:

"لوگو مدد کرو . . . خدا کے نام پر ایک پیسہ دیتے جاؤ . . . "

پر کوئی اس کی طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ ذرا سی دیر کے بعد فقیر نے اپنی جیب سے دو چار پیسے نکالے اور اندھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کُتّے نے دیکھ لیا۔ اور خوشی سے بھونکنے لگا۔ اندھے نے کانپتی انگلیوں سے پیسے ہاتھ میں لے لئے اور بولا:

"اے حضور تم جیتے رہو . . . اللہ تمہیں اس کا اجر دے . . ."

یہ دیکھ کر کہ اندھا اسے حضور کہہ کر مخاطب کر رہا ہے۔ فقیر کہنے ہی کو تھا:

"بھائی میں حضور نہیں۔ تمہاری طرح ایک مصیبتوں کا مارا ہوا بدنصیب ہوں . . ."

پر اپنے آپ کو روک لیا۔ جانتا تھا۔ لوگ اندھوں کو کیونکر مخاطب کیا کرتے ہیں۔ بولا:

"بابا بہت تھوڑا ہے . . ."

"اے حضور آپ کتنے دردمند ہیں . . . اتنی تو ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ اور میری خاطر آپ نے اپنا ہاتھ

جیب سے باہر نکالا . . . کچھ نہ پوچھئے اپاہجوں کے لئے
یہ کس بلا کا موسم ہے . . . ہائے اگر کہیں لوگوں کو
معلوم ہوتا . . . ''

فقیر کے دل میں رحم کا ایک چشمہ سا پھوٹ پڑا
منہ ہی منہ میں بولا:

''جانتا ہوں . . . جانتا ہوں . . .''

اس اپنے سے بھی زیادہ فلاکت زدہ شخص کے
مقابلے میں اپنی غربت کو بھول گیا۔ پوچھنے لگا:

''تم پیدائشی اندھے ہو؟''

''نہیں حضور . . . جوانی کے ساتھ بینائی بھی
جاتی رہی . . . ہسپتال میں کہتے تھے ضعیفی کا اثر ہے
. . . شاید موتیا بند کے مرض کا نام لیتے تھے . . . پر
مجھے معلوم ہے۔ اصل بات کیا ہے . . . جانتا ہوں۔
صرف ضعیفی ہی نے اندھا نہیں بنایا . . . مجھ پر بڑی
بڑی مصیبتیں گذری ہیں . . . میں نے بہت آنسو بہائے
ہیں . . . ''

ٹھاٹھ . . .

"بہت دکھ سہے ہیں تم نے ؟"

"حضور کچھ نہ پوچھئے . . . ایک ہی برس میں بیوی۔ بیٹی اور دو بیٹے گذر گئے . . . دنیا میں جن سے مجھے پیار تھا . . . اور جن کو مَیں پیارا تھا۔ سبھی اٹھ گئے خود بھی اَدھ مُوا ہو گیا تھا۔ پر رفتہ رفتہ سنبھل گیا . . . کسی کام کے قابل نہ رہا تھا۔ بس غربت نے آلیا . . . کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ بعض بعض دن کھانے کو بھی کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ کل سے کچھ نہیں کھایا۔ ایک ذرا سا سوکھی روٹی کا ٹکڑا نصیب ہُوا تھا۔ اس میں سے آدھا کُتّے کو دے ڈالا . . . آپ نے جو پیسے دئے ہیں۔ ان سے آج رات اور کل کے لئے تھوڑی سی اور روٹی خرید لوں گا۔"

اندھے کی باتیں سُن رہا تھا۔ اور فقیر جیب میں پونجی کو ٹٹول رہا تھا۔ چاہتا تھا۔ کہ چھُو چھُو کر پیسوں اور اکنیوں میں فرق معلوم کرے۔ اور گن لے کہ کیا کچھ موجود ہے۔ ساڑھے گیارہ آنے کے پیسے موجود تھے۔ بولا:

"میرے ساتھ آؤ۔ یہاں بڑی ٹھنڈ ہو رہی ہے
میں تمہارے کھانے کا بندوبست کئے دیتا ہوں"۔
خوشی کے مارے اندھے کا چہرہ تمتما اٹھا۔ لڑکھڑاتی
زبان سے بولا:

"اے حضور . . . بڑے سخی ہیں آپ . . ."

"آؤ . . ."

احتیاط برتی کہ اندھے کو یہ نہ معلوم ہونے پائے
کہ خود اپنے کپڑے کیسے میلے اور تتر بتر ہیں۔ اس کا ہاتھ
اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور دونوں روانہ ہو گئے۔ آگے
آگے کتا جا رہا تھا۔ سر اٹھا رکھا تھا۔ کان کھڑے کر رکھے
تھے۔ جب کسی ایسی سڑک پر سے گذرتے جہاں بھیڑ
زیادہ ہوتی۔ تو زور لگا لگا کر زنجیر کو کھینچنے لگتا۔ اسی
طرح بہت دیر تک چلتے رہے۔ آخر شاہراہ سے ہٹ
کر ویران سی سڑک پر ایک رستوراں کے سامنے رک
گئے۔

نقیر نے دروازہ کھولا۔ اور اندھے سے کہا۔

ٹھاٹھ۔۔۔

"اندر آجاؤ۔۔۔"

آتش دان کے قریب ایک میز منتخب کر کے فقیر نے اندھے کو بٹھا دیا۔ اور اس کے قریب خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند مزدوری پیشہ لوگ چپ چاپ بیٹھے چند چھوٹی چھوٹی اور بھدی رکابیوں میں سے بڑی بے تابی سے کھانا کھا رہے تھے۔ اندھے نے کتے کے گلے میں سے رسی الگ کر دی۔ اور ہاتھ آگ کے سامنے پھیلا دئے۔ آہ بھر کر بولا:

"یہاں کیسا آنند ہے۔۔۔"

فقیر نے خدمتگار لڑکی کو بلایا۔ اور تھوڑا سا شوربا اور گوشت لانے کو کہا۔ لڑکی نے پوچھا:

"اور تم خود کیا کھاؤ گے؟"

"کچھ نہیں۔"

ذرا سی دیر میں شوربا اور گوشت لا کر سامنے رکھ دیا گیا۔ شوربے کی خوشبو بڑی اشتہا انگیز تھی۔ اندھا

چپ چاپ آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ فقیر بیٹھا اسے تکتا رہا۔ ہاتھ میز کے نیچے کر رکھے تھے۔ روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر کتے کے آگے ڈالتا جاتا تھا۔ گوشت اور شوربا ختم ہو گیا۔ تو فقیر بولا:

"کچھ پی بھی لو۔ ٹانگوں میں جان سی پڑ جائے گی"۔

ذرا سی دیر بعد خدمت گار کو بلایا:

"کتنی رقم بنی؟"

"ساڑھے دس آنے"۔

ادا کر دئے۔ باقی کا ایک آنہ خدمت گار کو دے دیا۔ اور پھر اپنے ساتھی کو ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ جب دونوں سڑک پر آن پہنچے۔ تو پوچھنے لگا:

"کہیں دور رہتے ہو؟"

"ہم ہیں کہاں؟"

"سان لزارا اسٹیشن کے پاس"۔

"خاصی دور ہے دریا کے اس پار ایک سائبان

ہے۔ اس میں پڑا رہا کرتا ہوں"۔

"تھوڑی دور تک میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں"

اندھا شکریہ ادا کرتا رہا۔ وہ بولا:

"نہیں . . . نہیں . . . اس میں احسان کیا ہوتا . . ."

نہ جانتا تھا کیوں۔ پر خوش تھا۔ بے حد خوش۔ اتنا خوش کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ طرح طرح کے خیالات و تصورات میں محو چلا جا رہا تھا۔ اور یہ بھی بھول چکا تھا۔ کہ کل سے اپنے اوپر فاقہ گذر رہا ہے۔ رات کو کمر سیدھی کرنے کو ٹھکانا تک میسر نہیں۔ اپنی مصائب۔ اپنے چیتھڑے۔ اپنا افلاس سب بھولا ہوا تھا۔

ذرا ذرا سی دیر بعد بڑے اخلاق سے اندھے سے پوچھ لیتا۔

"میں بہت تیز تو نہیں چل رہا؟ تھک تو نہیں گئے؟"

بے چارہ اندھا اس لطف و کرم پر بچھا جا رہا

تھا۔ جواب دیتا:

"نہیں۔ نہیں . . . حضور کیا فرماتے ہیں . . ."

فقیر ہنس پڑا۔ یوں مخاطب کئے جانے پر بے حد مسرور تھا۔ دوسرے کو جس فریب سے لطف اندوز کر رہا تھا۔ خود متمول اور سخی ہونے کے جس انوکھے احساس سے لذت اٹھا رہا تھا۔ اس سے قلب کو تسکین اور راحت حاصل ہو رہی تھی . . .

گھاٹ پر دریا کے قرب کی وجہ سے ہوا خنک اور نمناک تھی۔ اندھا بولا:

"اب میں اکیلا راستہ ڈھونڈھ لوں گا۔ کتا ساتھ ہے"۔

فقیر نے تاثر سے کہا۔" ہاں اب میں رخصت ہوتا ہوں"۔

ایک انوکھا خیال اس کے دل پر مسلط تھا۔ تم جس ٹھاٹھ کے اکثر سپنے دیکھا کرتے تھے۔ جس کی آرزو تمہیں اس قدر بے چین کئے رکھتی تھی۔ کیا وہ خواب

آج حقیقت نہیں بن گیا؟ آخر کار آج تم نے پوری پوری خوشی کا لطف چکھ لیا۔ اس آخری گھنٹے میں تم نے اتنی مسرت حاصل کر لی۔ کہ نمول اور پر لطف غذاؤں اور محبت کے وحشیانہ خوابوں میں بھی کبھی جھانکتی نہ دیکھی تھی ۰ اس اندھے کو گمان بھی نہ گذرا تھا۔ کہ وہ ایک اپنے ہی سے مفلس شخص کے بازو کا سہارا لئے چلا جا رہا ہے . . . کیا تمہیں خود بھی اپنی امارت پہ یقین نہ آ گیا تھا! اور کیا پھر کبھی بھی اس رات کی سی گہری اور خالص خوشی سے لذت اندوز ہونے کی اُمید کر سکتے ہو؟

لیکن یہ سرور کے جذبات زیادہ دیر نہ رہے یک سخت حقیقت کا احساس لَوٹ آیا۔ اس نے دوبارہ کہا:

"ہاں . . . اب میں رخصت ہوتا ہوں"۔

پُل کے درمیان میں پہنچ گئے تھے۔ فقیر رُک گیا ایک مرتبہ پھر جیب ٹٹولی۔ کہ شاید اتفاق سے کوئی پیسہ بچ رہا ہو۔ ایک بھی باقی نہ بچا تھا . . ."

اس نے اندھے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرمجوشی سے دبایا۔ اندھا بولا:

"حضور کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں"۔

"میں اس قابل نہیں ہوں۔ سردی ہو رہی ہے جلدی سے گھر پہنچ جاؤ۔ زیادہ خوشی تو مجھ کو ہوئی ہے۔ خدا حافظ . . ."

چند قدم واپس لوٹا۔ تھم گیا۔ آنکھیں گاڑ کر نیچے کالے کالے اور دور تک پھیلے ہوئے پانی کو دیکھا۔ اور ایک بار پھر بلند آواز میں بولا:

"خدا حافظ . . ."

اور یک لخت اچھل کر جنگلے پر چڑھ گیا . . .

. . . دھائیں سی آواز آئی۔ اور پانی بڑے زور سے اِدھر اُدھر اُڑا . . . اور پھر آوازیں سنائی دینے لگیں . . . آنا آنا! . . . دریا کے کنارے پر پہنچنا!

اِدھر اُدھر سے لوگ دوڑ پڑے اور اندھے کو دھکیلتے ہوئے پُل پر آن پہنچے۔ اندھے نے پُوچھا "کیا بات

ٹھاٹھ۔۔۔

ہے؟ کیا ہوا؟"

ایک بازاری شخص اندھے سے ٹکرا گیا تھا بغیر

رُکے یہ کہتا ہوا چلا گیا:

"کوئی فقیر ڈوب مرا ہے"۔

اندھے نے اضمحلال کے انداز سے اپنے شانوں

کو جھٹکا اور بولا:

"اس میں کم از کم جرأت تھی۔ اس میں جرأت

تھی۔۔۔"

لال لیمپ کی روشنی میں

وہ آتش دان کے قریب ایک بڑی سی آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا رکھی تھیں۔ آگ تاپنے کے لئے ہاتھ آگے کو بڑھا دئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ بار بار خود ہی یک لخت اپنا قطع کلام کر دیتا۔ ہلکے ہلکے کہتا۔ "ہا۔۔۔ ہا۔۔۔" یہ معلوم ہوتا گویا اس دوران میں اپنے منتشر خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور پرانی یادوں کی صحت کے متعلق اطمینان کرنا چاہتا ہے۔ پھر اپنی تقریر شروع کر دیتا:

پاس ہی جو میز رکھی تھی۔ کاغذوں۔ کتابوں اور طرح طرح کی چھوٹی موٹی چیزوں سے لدی ہوئی تھی لمپ کی بتی نیچی کر رکھی تھی۔ آگ کی روشنی میں مجھے اس کے پیلے چہرے اور لمبے اور منحنی ہاتھوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آرہا تھا۔

قالین پر ایک بلی لیٹی خُرخُر کر رہی تھی۔ آتش دان میں لکڑیاں چٹخ چٹخ کر انوکھی وضع کے شعلے نکال رہی تھیں۔ اور بس یہی آوازیں تھیں۔ جن سے خاموشی ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔ وہ اس انداز سے بول رہا تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز کہیں دور سے آرہی ہے۔ جیسے کوئی نیند میں باتیں کر رہا ہے۔

"ہاں ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ یہ میری بہت بڑی سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔ میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتا۔ صبر کر لیتا۔ میری صحت غارت ہو جاتی ۔ ۔ ۔ کچھ اور جاتا رہتا ۔ ۔ ۔ سبھی کچھ جاتا رہتا۔ برداشت کر لیتا۔ پر یہ نہ ہوتا! جس عورت سے محبت بندگی کی

حد تک پہنچی ہوئی ہو۔ اس کے ساتھ دس سال تک زندگی بسر کرتا۔ اور اسے دم توڑتے ہوئے دیکھنا۔ اور پھر زندگی سے نپٹنے کے لئے اکیلے . . . بالکل اکیلے رہ جانا . . . یہ میری برداشت سے باہر تھا . . . چھ مہینے ہوئے کہ وہ مر گئی . . . معلوم ہوتا ہے۔ مدتیں گذر گئی ہیں! اور پہلے دن کس قدر مختصر ہوا کرتے تھے . . . میں کہتا ہوں۔ کچھ عرصہ علیل ہی رہتی۔ کسی طرح مجھے یہی معلوم ہو جاتا۔ کہ کسی قسم کا خطرہ ہے! . . . یوں کہنا بھلا تو نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن پہلے سے علم ہو جاتا ہے۔ تو انسان برداشت کے لئے آمادہ سا رہتا ہے۔ ہے نہ؟ . . . جو کچھ پیش آنے والا ہوتا ہے۔ دل اسی کے مطابق اپنے آپ کو تیار کر لیتا ہے . . . اس خیال سے مانوس سا ہو جاتا ہے . . لیکن یہاں تو . . .“

میں نے کہا: ”مگر مجھے تو کچھ ایسا خیال ہے۔ کہ تمہاری بیوی کچھ عرصے تک بیمار رہی تھی۔“

اس نے اپنا سر ہلایا:

"نہیں نہیں۔ بیمار کہاں رہی . . . سب کچھ اچانک ہی ہوگیا . . . ڈاکٹر اتنا بھی معلوم نہ کر سکے۔ کہ شکایت کیا ہے . . . سب کچھ دو ہی روز میں ہو کر قصہ تمام ہوگیا۔ اس وقت سے مجھے معلوم نہیں کہ مَیں آخر کیوں اور کس طرح جی رہا ہوں۔ سارے دن گھر میں اِدھر سے اُدھر اس تلاش میں پھرتا رہتا ہوں کہ اس کی کوئی یادگار مل جائے۔ جسے نہیں پا سکتا۔ یہ سمجھتا رہتا ہوں۔ کہ وہ کسی پردے کے پیچھے سے یکایک نکل کر میرے پاس آجائے گی۔ خالی کمرے میں اس کی خوشبو کا ایک جھونکا میرے لئے آنکلے گا . . ."

اس نے اپنے ہاتھ میز کی طرف بڑھا دئے:

"دیکھو کل مجھے یہ ملا . . . یہ نقاب میرے ایک کوٹ کی جیب میں تھا۔ ایک روز رات کو تھیٹر گئے تھے۔ وہاں اس نے اتار کر میرے پاس رکھوا دیا تھا۔ اب اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں۔ کہ اس

میں اب تک اس کی خوشبو موجود ہے۔ اس کے چہرے کے مس سے یہ اب تک گرم ہے . . . لیکن کہاں! کچھ نہیں رہا . . . بس ایک غم ہے . . . پر کچھ اور بھی ہے۔ اتنی بات ہے کہ . . . کہ . . .

'صدمہ کی پہلی یورش میں انسان کو طرح طرح کی باتیں سوجھتی ہیں . . . تمہیں یقین نہ آئے گا کہ جب وہ بستر مرگ پر پڑی تھی۔ تو میں نے اُس کی تصویر اتار لی تھی۔ میں سفید اور خاموش کمرے میں اپنا کیمرا لے گیا اور میگنیشیم کا تار روشن کر دیا۔ غم سے بے حد نڈھال تھا۔ پر میں نے بے انتہا احتیاط اور توجہ سے وہ باتیں کیں۔ جن سے آج شاید میں احتراز کروں۔ ایسی باتیں جن سے طبیعت قطعی گریز کرے . . . تاہم اس خیال سے بڑی تسلی ہوتی ہے۔ کہ اس کے نقش موجود تو ہیں۔ آخری روز وہ جس طرح نظر آ رہی تھی۔ اسی طرح میں اسے پھر دیکھ تو سکتا ہوں''۔

میں نے پوچھا" وہ تصویر کہاں ہے؟"

آگے کو جھک کر اس نے آہستہ سے جواب دیا!

"میرے پاس نہیں ہے۔ یا یوں سمجھ لو کہ ہے ... میرے پاس پلیٹ ہے۔ میں نے اُسے ڈویلپ نہیں کیا۔ ابھی تک کیمرے ہی میں ہے ... چھونے کا حوصلہ نہیں پڑا ... لیکن اُسے دیکھنے کو کتنا بے تاب رہا ہوں"۔

اُس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا:

"سنو ... آج رات ... تمہارا ملنے کو آنا ... جس طریقے سے میں اُس کے متعلق گفتگو کرتا رہا ... معلوم ہوتا ہے۔ اس سے میری حالت بہتر ہو گئی۔ جیسے مجھ میں پھر توانائی سی آ گئی ہے ... اب تم۔ میں نے کہا تم ڈارک روم میں میرے ساتھ چلو گے؟ پلیٹ ڈویلپ کرنے میں میرا ہاتھ بٹاؤ گے؟"

وہ ایسی پُر اشتیاق اور منتظر نگاہوں سے مجھے تکنے لگا۔ جیسے بچہ ہے اور اس امید و بیم کی حالت میں ہے۔ کہ جس چیز کو طلب کر رہا ہے۔ کہیں اس کے دینے

سے انکار نہ کر دیا جائے۔

میں نے کہا۔"ضرور۔شوق سے"۔

وہ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہُوا:

"ہاں . . . تمہارے ساتھ ہونے سے کچھ اُور بات ہوگی . . . تم ساتھ ہوگے۔ تو میں سنبھلا رہوں گا . . . میرے لئے اچھا ہوگا . . . بہت زیادہ خوش ہوں گا . . . تم دیکھ لینا . . ."

ہم ڈارک روم میں چلے گئے۔ ننھا سا کمرہ تھا جس کی الماریوں میں بوتلیں رکھی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ میز لگی تھی۔ جو شیشہ و آلات اور کتابوں سے لدی ہوئی تھی۔

ایک شمع لے کر جس سے کانپتی ہوئی روشنی نکل رہی تھی۔ وہ خاموشی کے عالم میں بوتلوں کی چیٹوں پر سے ان کے نام پڑھتا رہا۔ اور بعض ظروف کو صاف کرنے میں مصروف رہا۔

"دروازہ بند کر دو"۔

لال لمپ کی روشنی میں

یہ تاریکی جسے صرف لال روشنی زائل کر رہی تھی۔ ایسی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے اہم واقعات کی خزینہ دار ہے۔ انوکھے عکس بوتلوں کے پہلوؤں پر۔ اس کے مرجھائے ہوئے رخساروں پر بیٹھی ہوئی کنپٹیوں پہ پڑتے نظر آرہے تھے۔ وہ بولا:

"دروازہ اچھی طرح بند ہے نہ؟ تو اب شروع کرتا ہوں"۔

اس نے ایک سیاہ سلائیڈ کھولی۔ اور اس میں سے پلیٹ نکال لی۔ اسے انگوٹھے اور بت انگلیوں میں کونوں پر سے باحتیاط تھام کر وہ دیر تک بڑے غور سے تکتا رہا۔ جیسے اس مخفی تصویر کو جو بہت جلد ظاہر ہونے والی تھی۔ پہلے سے دیکھ لینا چاہتا ہے۔ منہ ہی منہ میں بولا" وہ اس میں ہے۔ کیا عجیب بات ہے!"

بڑی احتیاط سے اس نے پلیٹ کو ادویات میں چھوڑ دیا اور ڈش کو ہلانے لگا۔

نہیں جانتا کیوں۔ پر مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ جب ہلانے کے باعث ڈِش باقاعدہ وقفوں سے میز سے ٹکراتی تھی۔ تو یہ ٹک ٹک ایک عجیب الم بھری آواز معلوم ہوتی تھی۔ ڈِش میں ادویات کے ملنے سے جورپ رپ کی آواز پیدا ہوتی۔ اسے سن کر کچھ سسکیوں کا خیال آجاتا تھا۔ میں نے اس دودھیا رنگ کے شیشے پر نظریں گاڑ رکھی تھیں۔ اور دیکھ رہا تھا۔ کہ اس کے کناروں پر رفتہ رفتہ ایک سیاہ لکیر سی اُبھری آ رہی ہے۔

اپنے دوست پر نظر ڈالی۔ تو دیکھا کہ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ ایسے الفاظ اور فقرے بول رہا تھا۔ جنہیں میں سُن نہ سکتا تھا۔

اس نے پلیٹ باہر نکال لی۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے لایا۔ میں اس کے شانوں کی طرف جُھک گیا تھا۔ وہ بولا:

"اُبھرتی آ رہی ہے . . . آہستہ آہستہ . . . دوا کسی قدر ہلکی ہے . . . پر کیا ہُوا . . . دیکھو تیز روشنی کے مقام ظاہر ہو گئے ہیں . . . ٹھہرے رہو . . . ابھی دیکھ لو گے . . ."

پلیٹ کو پھر ڈش میں ڈال دیا۔ ایسی آواز سے جیسے کچھ چوسا گیا ہو۔ وہ دوا میں ڈوب گئی۔

ہلکا ہلکا کالا رنگ یکسانی سے تمام پلیٹ پر پھیل چکا تھا۔ وہ سر جھکائے اُسے تک رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ تصویر کے متعلق مجھے معلومات بھی بخشتا جا رہا تھا:

"یہ کالی مستطیل پیار پائی ہے . . . ذرا اوپر وہ مربع . . ."

اس نے اپنی ٹھوڑی کی حرکت سے اس کی طرف اشارہ کیا . . . "تکیہ ہے اور درمیان میں جو جگہ ہلکی ہلکی سیاہ نظر آ رہی ہے۔ یہ جہاں سیاہی کے سامنے ہلکی سی دھا۔ نی ہے . . . وہ . . . دیکھو

وہ رہی صلیب جو میں نے اس کی انگلیوں میں دے دی تھی . . . میری دکھیا بیوی . . . میری جان!
. . . "

جذبات کی شدت سے اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ سینہ ابھرتا اور بیٹھ جاتا تھا۔ رخساروں پر آنسو بہ رہے تھے۔

ذرا سی دیر میں اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا:

"باریک چیزیں بھی واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ مجھے پھول اور روشن شمعیں نظر آ رہی ہیں . . . اس کے بال بھی۔ ہائے کتنے حسین تھے . . . ہاتھ جن پر اسے اتنا ناز تھا . . . اور وہ ننھی سی سفید تسبیح جو مجھے اس کی بائیبل میں سے ملی تھی . . . خداوندا ان سب چیزوں کو پھر دیکھنے سے کتنا دکھ ہوتا ہے۔ لیکن یہ کسی نہ کسی طرح مجھے خوشی بخش رہی ہیں . . . بڑی خوشی . . . میں پھر اسے دیکھ رہا ہوں۔ اپنی جان سے

پیاری محبوبہ کو ۔ ۔ ۔"

دیکھا کہ جذبات پھر اُسے بے قابو کئے دے رہے ہیں۔ میں تسلی دینا چاہتا تھا۔ بولا:

"کیا خیال ہے۔ پلیٹ تیار نہیں ہوگئی؟"

اُس نے اُسے لمپ کے سامنے کیا۔ بڑے غور سے دیکھا۔ اور پھر دوا میں ڈال دیا۔ ذرا سے وقفے کے بعد دوبارہ باہر نکالا۔ پھر دیکھا اور پھر واپس ڈال دیا۔ منہ ہی منہ میں بولا:

"نہیں ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔"

مجھے اُس کی آواز اور بُشرے میں فوری تغیّر سا معلوم ہوا۔ مگر اس کے متعلق غور کرنے کی مہلت نہ ملی۔ فوراً ہی اُس نے پھر باتیں شروع کر دیں:

" ابھی بعض تفصیلات نمایاں نہیں ہوئیں ۔ ۔ کسی قدر دیر لگ گئی ہے ۔ ۔ ۔ پر میں نے کہا تھا نہ دوا کمزور ہے ۔ ۔ ۔ ایک ایک کر کے سب چیزیں اُبھر آئیں گی"

اس نے گِننا شروع کر دیا۔ "ایک . . . دو . . . تین . . . چار . . . پانچ . . . بس اتنا کافی ہے۔ اور زیادہ کوشش کی۔ تو کہیں بگڑ ہی نہ جائے . . ."

اُس نے پلیٹ باہر نکال لی۔ عموداً اوپر نیچے کر کے ہلائی۔ صاف پانی میں ڈبوئی۔ اور پھر میری طرف بڑھا دی:

"دیکھو!"

میں اپنا ہاتھ بڑھا ہی رہا تھا۔ کہ وہ تصویر کو گھورتا گھورتا آگے کو جُھک گیا۔ تصویر عین لمپ کے سامنے کر لی۔ یک لخت اُس کا چہرہ لال روشنی میں مُردوں سے مشابہ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے چلا کر کہا:

"کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟"

وہ پھٹی پھٹی ہیبت زدہ نظروں سے برابر تصویر کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کچھ پیچھے کو سرک

گئے تھے۔ دانت بجتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مجھے سنائی دے رہا تھا۔ کہ اس کا دل دھک دھک کر رہا ہے۔ اس طرح دھڑک رہا ہے۔ کہ کبھی اس کا جسم آگے کو اور کبھی پیچھے کو جھک جاتا ہے۔

میں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ اس خوفناک کرب کی کیا ممکن وجہ ہو سکتی ہے۔ میں نے دوبارہ چلا کر کہا:

"پر ہے کیا؟ بتاؤ تو۔ کیا بات ہے؟"

اُس نے چہرہ میری طرف پھیر لیا۔ یوں لٹک سا گیا تھا۔ کہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ انسانی چہرہ ہے۔ اس کی لال انگارہ سی آنکھیں مجھ سے چار ہوئیں۔ میری کلائی کو اس زور سے پکڑ لیا۔ کہ ناخن میرے گوشت میں پیوست ہو گئے۔

تین بار منہ کھولا۔ کچھ بولنا چاہتا تھا۔ پھر تصویر کو اپنے سر پر گھمایا۔ اور اس خون آلود اندھیرے میں چیخ چیخ کر کہنے لگا:

لال لیمپ کی روشنی میں

"ہات!... ہات!... خداوندا!...
مَیں نے اُسے مار ڈالا!... وہ مری نہ تھی... آنکھیں
ہل گئی ہیں!..."

ایک غلطی

مریض نے کہا۔" ڈاکٹر صاحب۔ میں چاہتا ہوں
آپ میرا معائنہ کر کے مجھے بتائیں۔ کہ مجھے دِق تو نہیں
ہے۔ میں اپنے مرض کی ٹھیک کیفیت معلوم
کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت موجود ہے۔ کہ ٹھنڈے
دل سے بدتر سے بدتر اطلاع سُن لوں۔ میں سمجھتا ہوں
آپ کا فرض ہے۔ کہ آپ نہایت صفائی سے بلا کم و
کاست سب کچھ بیان کر دیں۔ اور مجھے اس بات کا
حق حاصل ہے۔ کہ میں اپنی صحیح حالت سے اچھی طرح
آگاہ ہو جاؤں۔ آپ وعدہ فرماتے ہیں۔ کہ آپ یوں

ہی کریں گے؟"

ڈاکٹر نے کچھ تامّل کیا۔ اپنی کرسی پیچھے دھکیل لی۔ آتش دان کی طرف جھکا۔ جس میں بڑی بڑی لکڑیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔ بولا۔

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔ تم اپنے کپڑے اُتار ڈالو۔"

مریض نے اپنے کپڑے اُتار دیے۔ ڈاکٹر اس سے سوال کرتا رہا:

"آپ کو ضعف کی شکایت ہے؟ رات کو پسینہ آتا ہے؟ ... پہلے آتا تھا۔ اب نہیں آتا۔ کھانسی زیادہ اُٹھتی ہے؟ ... صبح کو ہلکی ہلکی کھانسی کا دورہ ہوتا ہے؟ ... آپ کے والدین زندہ ہیں؟ کچھ معلوم ہے ان کا انتقال کیسے ہُوا تھا؟ ..."

مریض نے اپنا سینہ ننگا کر دیا۔ اور بولا:

"میں حاضر ہوں۔"

ڈاکٹر نے مریض کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اور

اُنگلیوں کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک کوشش کا معائنہ شروع کیا۔ مریض نہایت غور سے اپنے امتحان کے تمام مدارج دیکھ رہا تھا۔ پیر سے پیر ملائے۔ بازوؤں کو ڈھیلا چھوڑے ٹھوڑی اونچی کئے کھڑا تھا۔ اور نہایت توجہ سے ڈاکٹر کے الفاظ کا منتظر تھا۔ کمرے کی خاموشی میں ڈاکٹر کی انگلیاں مریض کے سینے پر ٹھک ٹھک کر رہی تھیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر دیر تک بڑی احتیاط سے آلے کے ذریعے سینہ دیکھتا رہا۔ جب معائنہ ختم کر چکا تو اس نے مربیانہ انداز میں مریض کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور مسکرا پڑا:

"کپڑے پہن لو۔ تم خوب تندرست اور توانا ہو۔ زیادہ ضعف اعصاب کی شکایت ہے۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ اور کچھ خرابی نہیں . . . تم یہ سُن کر کچھ خوش نظر نہیں آتے؟"

مریض کپڑے پہن رہا تھا۔ رُک گیا۔ آستینوں

ایک غلطی

میں ڈالنے کے لئے ہاتھ اُوپر اُٹھا رکھے تھے۔ سر گریبان میں سے آدھا باہر تھا۔ آنکھوں میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ انداز تمسخر سے ہنس کر بولا:

"نہیں میں خوش ہوں ... بہت خوش ..."

بہت چُپ چاپ باقی کپڑے پہنے۔ ڈاکٹر میز پر بیٹھا نسخہ لکھ رہا تھا۔ اُسے اشارے سے روک دیا۔ "لیکن ..."

جیب سے ایک سکّہ نکال کر میز کے کونے پر رکھ دیا۔ بیٹھ گیا۔ اور ذرا کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "مَیں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے اٹھارہ مہینے پہلے ایک مریض نے یہاں آکر آپ سے یہی سوال کیا تھا۔ جو چند منٹ پیشتر میں کر رہا تھا۔ کہ مجھے میری صحیح حالت بتا دیجئے۔ آپ نے جلدی جلدی اُس کا معائنہ کیا تھا۔ یہ سب سچ ہے ... اور اسے کہا تھا کہ تمہیں دِق ہے۔ تمہاری حالت نازک ہے ... آپ اب تردید مت کیجئے۔ اپنی بریت میں کوئی دلیل

پیش نہ کیجئے۔ مَیں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ اس کی صداقت کے متعلق مجھے پختہ یقین ہے . . . اور اسے تاکید کی تھی کہ تمہیں شادی ہرگز نہیں کرنی چاہئے۔ اور تمہارے ہاں بچے ہونا بھی بُری بات ہوگی"۔

ڈاکٹر نے ہلکے سے کہا۔" مجھے یاد نہیں رہا۔ ممکن ہے یوں ہی ہوا ہو . . . میرے ہاں اس کثرت سے مریض آتے ہیں . . . لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس واقعہ کو بیان کر کے آپ کس نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں . . . ؟"

"اس نتیجے پر کہ وہ مریض مَیں تھا۔ مَیں نے اس وقت آپ سے جھوٹ کہا تھا۔ کہ میری شادی نہیں ہوئی۔ میری شادی ہو چکی تھی۔ اور مَیں کئی بچوں کا باپ بھی بن چکا تھا۔ مَیں جب آپ کے مطب کا دروازہ بند کر کے رخصت ہو گیا۔ تو آپ نے شاید پھر ایک منٹ کے لئے بھی میرے متعلق کچھ نہ سوچا ہوگا۔ ان ہزاروں تیرہ بختوں میں جو ہر سال دِق کا شکار ہو کر مرتے ہیں۔

ایک غلطی

ایک میں کس قطار و شمار میں تھا؟ لیکن میرے لئے آپ کی تشخیص کے لیے انتہا بھیانک نتائج نکلے۔
مریض نے ہاتھ آنکھوں پر پھیرا۔ اور بولتا رہا۔
"میں جب گھر پہنچا تو میری بیوی اور ننھی بچیاں میری منتظر تھیں۔ جاڑے کا موسم تھا۔ گھر کے اندر ہر طرح کی آسائش موجود تھی۔ انگیٹھی میں آگ خوب دہک رہی تھی۔ خوش گوار حرارت۔ راحت، مسرت سبھی کچھ موجود تھا۔ اس دن تک میں بے حد ذوق شوق سے گھر لوٹنے کے وقت کا منتظر رہتا تھا۔ اور اپنے پیاروں کے مجمع میں گھر کر آرام کرنے سے بے پایاں لطف حاصل کیا کرتا تھا۔ بیوی سے مل کر بچوں کو چوم کر نہال ہو جاتا تھا۔ تمام دن اس گھڑی کے لئے بے تاب رہتا تھا۔ کہ کب اپنے تفکرات اور کاروبار کی پریشانیاں بھلا کر عزیزوں میں بے فکری سے وقت گذار سکوں گا۔
لیکن اس روز شام کو بیوی جب میرے قریب آئی

تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ جب میری ننھی بچیاں مجھ سے لپٹنے کے لئے دوڑ کر آئیں۔ تو میں نے انہیں دُور ہٹا دیا۔

"میرے دماغ میں جو بیج تم نے ڈال دیا تھا وہ اب سرسبز ہو رہا تھا۔

"ہم کھانا کھانے بیٹھے۔ کھانے کے دوران میں میں کوشش کرتا رہا۔ کہ میری آشفتہ خیالی کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ لیکن میں اُداس تھا۔ شکستہ حال تھا۔ ان بے چاروں کا خیال کر رہا تھا۔ جن سے بہت جلد بچھڑ جانا تھا۔ خاندان کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کہ بے آسرے رہ جائے گا۔ معصوم بچوں کی فکر میں غرق تھا۔ کہ بغیر شفقت پدری کے پروان چڑھیں گے۔

"دوسرے لوگ جو اپنی موت کو یقینی سمجھ لیتے ہیں۔ اپنا اتنا ارمان تو نکال سکتے ہیں۔ کہ جنہیں پیچھے چھوڑ جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انہیں سینے سے لگا سکتے ہیں۔ اس قسم کی راحتوں سے لطف اندوز ہو کر

ایک غلطی

دوسرے جہان کا رُخ کرتے ہیں۔ لیکن میں . . جب کسی کے نزدیک جاتا۔ اُس کے لئے طرح طرح کے خطرات سے بھرا ہُوا تھا۔ اپنے اندر موت کو لئے پھرتا تھا۔ زندہ تھا۔ مگر جان داروں کے زمرے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ دوسرے لوگوں کی مسرتوں میں اب مجھے کسی قسم کا حق حاصل نہ تھا۔

". . . جب سونے کا وقت آیا۔ تو میرے بچے حسب معمول میرے گرد جمع ہو گئے۔

"میں نے انہیں پیچھے ہٹا دیا۔ میرے منہ بھیانک منہ کو پھر اُن کے منہ تک ہرگز نہ جانا تھا۔ ذرا سی دیر بعد میں لیٹ گیا۔ رفتہ رفتہ گھر پر اور کوچہ و بازار میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے اپنا لمپ بجھا دیا۔ اور بیوی کے پلنگ کے برابر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ جاگتا رہا۔ اور بیوی کے سانس کی ہلکی ہلکی آواز کو سنتا رہا۔

"محرومِ خواب رات کے طویل گھنٹے سہج سہج گذر

ایک غلطی

رہے تھے۔ مَیں بار بار ہاتھوں سے چھاتی کو دباتا تھا۔ اور اپنی انگلیوں سے اپنے پھیپھڑوں کے کمزور مقامات کو معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کسی قسم کے درد کی شکایت نہ تھی۔ کوئی ایسی تکلیف نہ تھی۔ کہ آپ کی تشخیص پر یقین کرنے کو دل چاہتا۔ فطرت انسانی یونہی بے معنی بغاوتوں پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ خیال خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ مَیں نے یہ یقین کر کے اپنے دل کو تسلی دے لی۔ کہ آپ نے مرض کے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔ مَیں نے اپنے آپ سے کہا یہ غلط ہے ناممکن ہے۔ مَیں دوسرے ڈاکٹر کی رائے لوں گا۔۔۔

یک لخت مجھے ساتھ کے کمرے میں سے کھانسی کی آواز آئی۔ مَیں چونک اُٹھا۔ میرے بچوں کے کمرے میں سے پھر کھانسی کی آواز آئی۔ خشک۔ تیز اور جھنکاردار سی آواز۔ دہشت کے مارے مَیں نے اپنے ہاتھ اپنی بیوی کی طرف بڑھا دئیے۔ لیکن مجھے اس کو جگانے کی جرأت نہ پڑی۔ مَیں گوش برآواز

ہو گیا۔ کھانسی پھر شروع ہوئی۔ میں چپکے سے اُٹھا اور اس کمرے میں گیا۔ جہاں بچے سو رہے تھے۔ لمپ کی مدھم روشنی میں وہ اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ بڑی لڑکی کا چہرہ تمتما رہا ہے۔ میں نے اُس کے ہاتھ کو چھُوا گرم معلوم ہوا۔ میں اس کے اوپر جھُکا۔ اسے کئی بار کھانسی اُٹھی۔ اور وہ بے چینی سے تکیے پر کروٹیں لیتی رہی۔ میں دیر تک اس کے پلنگ کے برابر کھڑا رہا۔ وہ کھانستی رہی۔ واپس بستر پر آیا۔ لیٹا ہی تھا کہ ایک بھیانک خیال نے میرے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ میری طرح یہ بھی دِق کا شکار ہو چکی ہے"

"مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہ رہا۔ میں نے اسے بطور ایک حقیقت کے قبول کر لیا"۔

مریض آگے کو جھُکا۔ اس نے اپنے پنجے گھٹنوں پر جما رکھے تھے۔ پوچھنے لگا:

"تم کو اس وقت خیال بھی نہ ہوگا۔ تم نے کیا کر

دیا تھا۔ تھا خیال؟

"دوسرا دن ناقابل برداشت تھا۔ مجھے جرأت نہ پڑتی تھی۔ کہ اپنی بیوی سے یہ کہوں۔ ہماری بچی بیمار ہے۔ مجھے ڈاکٹر کو بلانے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ کہ ڈاکٹر جی ہیں کیا کہے گا۔ مجھے اپنے اوپر شرم آرہی تھی۔ بزدلی نے مجھے گم سُم بنا رکھا تھا۔"

"لیکن میرا دماغ بیکار نہ تھا۔ اب مرض کے متعدی ہونے ہی کا خطرہ نہ تھا۔ ایک اس سے بھی زیادہ خوفناک بھوت میرے روبرو کھڑا تھا۔ وراثت کا بھوت۔ جس طرح میرے بچوں نے مجھ سی آنکھیں۔ اور مجھ سے بال وراثتاً پائے ہیں۔ یونہی انہیں میرے طبعی نقائص بھی وراثتاً ملے ہیں۔ اگر وہ اس ہیبت ناک قانون فطرت کے اثرات سے بچ بھی گئے تھے۔ تو صرف اس امر نے کہ میں ان کے بہت قریب تھا۔ انہیں آلودہ کر ڈالا ہے۔"

"تم کہتے ہو۔ یہ صرف تخیل تھا؟ لغو ہے۔ تم نے

اور تمہاری تمام برادری نے خاص کوشش و محنت سے اخباروں اور رسالوں اور جلسوں کے ذریعے لاعلم لوگوں کو یہ تمام باتیں ذہن نشین نہیں کرائیں؟ . . .

"جو کچھ میں سُن اور پڑھ چکا تھا۔ میرے دماغ میں ایک طوفان کی طرح چڑھ آیا:

"یکے بعد دیگرے میری بیوی اور ننھی بچیاں رفتہ رفتہ کملا کر رہ جائیں گی۔ اور اپنے حسرت ناک انجام کے آنے تک اپنی شہید زندگیوں کو مصیبت میں گذاریں گی . . . اور میں۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھنا ہوگا۔ ان کے روبرو۔ ان کے گھلتے ہوئے جسموں میں بیماری کی ترقی کو دیکھنا ہوگا۔ اور دنیا کا کوئی علم تقدیر کی اس تحریر کو نہ مٹا سکے گا":

مریض نے اپنی انگلی اُٹھائی۔ اور آہستہ آہستہ بھاری آواز میں بولتا رہا:

"اور پھر غور سے سنتے رہو۔ ان خیالات کی دہشتوں میں گھر کر میرے دماغ میں یہ خیال پختہ ہو

چلا۔ کہ ایسے حالات میں جب انسان کو علم ہو۔ انجام کیا ہونے والا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ مصیبتوں کو تمام کرنے کی کوشش کرے۔ اس بات کا حق حاصل ہے۔ کہ جو خود کیا ہے۔ اُسے خود ہی ملیا میٹ کر دے جن ہستیوں کو طبعی کرب و بلا میں مبتلا کیا ہے۔ اُنہیں خود ہی مٹائے۔ تمام کر ڈالے۔ اس کا فرض ہے۔ کہ انہیں بُرے انجام سے بچانے کے لئے تقدیر بن جائے۔

"تم جُھرجُھری لیتے ہو۔ ان باتوں کو پوری طرح سمجھنے سے ڈرتے ہو؟ . . . ہاں میں نے اپنے ہاتھوں اپنے بچّوں کو مار ڈالا۔ سنتے ہو؟ انہیں مار ڈالا" میں نے انہیں زہر دیا اور یہ کام ایسی عجلت اور ہوشیاری سے سرانجام پایا۔ کہ مجھ پر کسی کو ذرا بھی شُبہ نہ ہُوا۔

" پہلے میں چاہتا تھا۔ اپنا کام بھی تمام کر ڈالوں مگر میں سزا کا مستحق تھا۔ اس لئے نہیں کہ میں نے انہیں مار ڈالا تھا۔ میں اپنے اعمال کو جائز اور مناسب

سمجھتا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ میں ہی انہیں دنیا میں لانے کے جرم کا ذمہ دار تھا۔ اس سے زیادہ اور کونسا کفارہ ادا کرنا میرے اختیار میں تھا۔ کہ میں نے زندگی کے جن آلام و مصائب سے انہیں محفوظ رکھا تھا۔ ان کو خود برداشت کروں؟ جس دکھ درد سے انہیں آزاد کر دیا تھا۔ اس کو خود سہوں۔

"سنو پھر کیا ہوا۔ ان کے مرنے کے چند ہفتوں بعد مجھ میں دوبارہ طاقت آنی شروع ہو گئی۔ پسلیوں کا درد جاتا رہا۔ حلق سے خون آنا بند ہو گیا۔ میں تندرست اور توانا نظر آنے لگا۔

"پہلے پہل میں سمجھا۔ کہ محض اتفاق سے بیماری کی ترقی عارضی طور پر رک گئی۔ اور کچھ عرصہ بعد اس سے زیادہ زور شور سے حملہ آور ہو گی۔ لیکن چند ماہ بعد واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے کے سوا میرے لئے چارہ نہ رہا۔ میری حالت دن بدن سنور رہی تھی۔ میں شفا پا رہا تھا۔ ۔ ۔ میں شفا کا نام لے رہا ہوں۔

لیکن کیا مجھے کبھی دِق ہوئی بھی تھی؟
"یہ خیال شروع شروع میں وہم سا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے یقین کی صورت اختیار کرنی شروع کی۔ جانتے ہو۔ اس کے کیا معنی تھے؟ اگر مجھے دِق تھی۔ تو جو کچھ میں نے کیا جائز و ضروری تھا۔ اگر مجھے دِق نہ تھی۔ تو میں نے بلاوجہ بلا عذر خون کئے تھے۔

میں نے سال بھر تک کوشش کی۔ کہ کسی طرح کوئی صحیح فیصلہ کر لوں۔ مجھے اُمید تھی۔ رُکی ہوئی بیماری دوبارہ عود کر آئے گی۔ طرح طرح کی بے احتیاطیاں کرتا تھا۔ کہ بیماری پھر اپنا کام شروع کر دے۔ مگر بے سود۔ اور پھر مجھے یقین ہو گیا پختہ یقین۔ کہ تمہاری تشخیص بالکل غلط تھی۔ تم نے فیصلہ سنانے میں قابل شرم غلطی کی تھی۔ ایک عظیم ملال اور افسردگی نے مجھ پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔ میں نے دانستہ اپنی زندگی برباد کی تھی۔ معصوموں کی

ایک غلطی

جان لی تھی ۔ زندگی کے ان اداس اور رنجیدہ سالوں کو جنہیں گذارنا دوبھر ہو رہا تھا ۔ خود دعوت دی تھی اور یہ سب کچھ کس لئے ؟ محض تمہاری غلطی کی وجہ سے ۔ اور اب آج میں آیا ہوں ۔ کہ تمہاری زبان سے تمہاری غلطی کا اعتراف سُنوں "۔ مریض اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اپنے ہاتھ چھاتی پر باندھ لئے :

"اس سے زیادہ حماقت سے تم اَور کس طرح اعتراف کر سکتے تھے ؟ ابھی جب تم نے مجھے یقین دلایا ۔ کہ میری صحت میں خرابی نہیں ۔ کسی قسم کی خرابی نہیں ۔ تو تم نے میری آنکھوں کو نہ دیکھا ۔ اگر تم اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالتے ۔ تو دہشت سے کانپ اُٹھتے ۔ میری تمام داستان ۔ میری آنکھوں میں پڑھ لیتے . . . "

ڈاکٹر کا رنگ فق ہو گیا تھا ۔ اس نے رُک رُک کر کہا :

" انسان سے غلطیاں ہو جاتی ہیں ۔ میں انسان

ہوں . . . ان دنوں دِق کا خیال اس قدر عام ہو چکا ہے۔کہ ہر چیز میں گھر کر لیتا ہے . . . غیر محسوس طور پر اپنا اثر ڈال دیتا ہے . . . بعض اتفاقی۔ محض عارضی علامات کو اہمیت دے دینا بعید از قیاس نہیں . . . مجھ سے غلطی ہو گئی ہو گی . . . بڑے بڑے ڈاکٹروں نے تشخیص میں غلطی کی ہے . . . میں پھر تمہارا معائنہ کرتا ہوں . . . "

مریض نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا:

"معائنہ کرتے ہو؟ خوب . . . تم نے مجھے کس قسم کا احمق سمجھ رکھا ہے؟ خود دوڑ کر تلوار کی نوک تک آپہنچے ہو۔ اور اب پینترا بدل کر صاف بچ جانا چاہتے ہو؟ میری صحت میں کوئی خرابی نہیں اس مرتبہ معقول وجوہ کی بنا پر میں بلا تامل تمہارے لفظوں پر یقین کرتا ہوں :.

"لیکن تم نے مجھے قاتل بنایا۔ تم قتل میں میرے معاون تھے۔ بلا قصد معاون؟ میں تمہاری تائید کرتا

ہوں۔ تم دماغ تھے اور مَیں بازو۔ اور چونکہ انصاف کا طریق ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس لئے میں . . . تندرست اور توانا شخص۔ ضعفِ اعصاب کا شکار . . . مَیں انصاف کرتا ہوں۔ تمہیں مجرم ٹھہراتا ہوں اور خود ہی تم کو سزا دیتا ہوں"۔

دو گولیاں چلنے کی آواز کمرے میں گونجی۔ نوکر اندر دوڑے آئے۔ تو دیکھا کہ دو بے جان جسم زمین پر چت پڑے ہیں۔ کچھ خون اور بھیجا اُچھل کر میز پر آن پڑا تھا۔ اُن سے اس کاغذ پر سُرخ داغ پڑ گئے تھے۔ جس پر یہ نامکمل نسخہ لکھا ہُوا تھا:

برومائیڈ۔ پندرہ گرین
مصفّا پانی . . .

تخفیفِ جرم کی وجہ

اخباروں کے ذریعے فرانسواز کو معلوم ہوا تھا کہ اس کا بیٹا گرفتار کر لیا گیا ہے۔ پہلے پہل اس کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔ کیسے آتا؟ بات ہی ایسی ہیبت ناک تھی۔

اس کا بیٹا۔ ننھا سا بیٹا۔ اتنا خوش اطوار۔ ایسا شرمیلا۔ جو ابھی پچھلے ہی مہینے ایسٹر کی تعطیل اس کے ساتھ بسر کر کے گیا تھا۔ چور اور خونی؟ ۔ ۔ ۔ نظر آتا تھا۔ جیسے وہ سپاہیوں کی وردی پہنے پھر اس کے روبرو کھڑا ہے۔ اور اُس کے تر و تازہ اور گول

گول چہرہ پر محبت اور مسکراہٹ برس رہی ہے۔
ایسا معلوم ہوتا تھا وہ الوداع کہہ کر پھر اُس کے
مرجھائے ہوئے رخساروں کو جوش سے چوم رہا ہے۔
بیٹے کی یہ مسرت بخش اور فرحت انگیز باتیں یاد آئیں۔
تو وہ سر ہلا کر پھر کہنے لگی:

"خدا نہ کرے! وہ کیوں ہونے لگا تھا؟ کچھ
غلطی ہوئی ہے۔ یہ کوئی اور ہوگا"۔

مگر اسے کیا کرتی؟ اخبار پر جلی حروف میں
یہ عنوان لکھا تھا"۔ ایک مجرم سپاہی!" واقعہ اُن ہی
بارکوں کا تھا۔ جن میں بیٹا رہتا تھا۔ اور ساتھ ہی
اس کا پورا نام بھی درج تھا۔

مبہوت سی ہو کر کرسی میں دبک رہی عینک
کو پیشانی پر سرکا دیا تھا۔ ہاتھ ملا کر بھینچ رکھے تھے۔
گرم گرم باورچی خانے میں سناٹا طاری تھا۔ اور اس
کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ منہ
ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھیں کبھی

بوڑھے کُتے پر گاڑ دیتی۔ جو کھلے دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ کبھی ہلیونزرے کلاک کو تکنے لگتی۔ جس کی سُست رفتار ٹک ٹک بڑی متانت سے وقت کو گھسیٹے لئے جاتی تھی۔

کوئی گھر میں داخل ہوا۔ اضطراب سے چونک کر چلا اُٹھی:

"کون ہے؟" دیکھا تو ہمسائی تھی۔ اپنی بیتابی کو چھپانا چاہتی تھی۔ بولی:

"میری آنکھ لگ گئی تھی . . . بڑی گرمی ہے . . ."

عادتاً خلوت پسند اور خاموش تھی۔ پر آج برابر بولے چلی جاتی تھی۔ خود ہی سوال کرتی۔ خود ہی جواب دیتی۔ ڈرتی تھی کہیں ہمسائی نہ اس سے کچھ پُوچھ بیٹھے۔ بے ربط فقرے بول رہی تھی۔ اور دماغ میں بس ایک ہی خیال گھوم رہا تھا۔ "کہیں اسے معلوم تو نہیں ہو چکا؟"

آخر جب بولتے بولتے ہار گئی۔ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ اور کیا کہے۔ تو مجبوراً تھک کر چپکی ہو رہی، ہمسائی نے کچھ عجیب سا منہ بنا کر کہا۔

"تمہیں اپنے بیٹے کی خبر خیریت مدت سے نہیں ملی؟"

"نہیں . . . آج صبح ہی ملی تھی"۔

یہ نہ کہا۔ کیسے ملی۔ لیکن کہتے کہتے ایک طوفان کی طرح دل میں یہ ارمان پیدا ہوا۔ کہ جو شبہے میرے دل میں موجود ہیں۔ کوئی دوسرا ان کی تردید کر کے اطمینان دلائے۔ تشفی دے۔ کہیں سے کوئی آواز آئے۔ جو میرے غم اور غصے سے ہم نوا ہو کر کہہ رہی ہو۔

"کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ تمہارا بچہ کیوں ہونے لگا تھا؟ . . . بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟"

اخبار ہمسائی کی طرف بڑھا دیا۔ اور دلجمعی سے کہنے کی کوشش کی:

"تم نے یہ بھی دیکھا . . . عجب پہیلی ہے
ہے نا؟"

گلا سوکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈے
چلے آرہے تھے۔ ساتھ ہی بولی :
کیسی پگلی ہوں . . . پہلے پہل دیکھا۔ تو میرے
تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی . . . سٹھیا گئی ہوں . . ."
ہمسائی اب بھی گم سم بیٹھی رہی۔ بڑھیا نے
کہا :

"پر ہے کیسے اچنبھے کی بات۔ ہے نا؟ . . .
بڑے ہی اچنبھے کی بات ہے!"

"ہاں عجیب ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ ایک
ہی رجمنٹ میں ایک نام کے دو آدمی ہوں"۔

بڑھیا نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ بولی۔
"ہاں یہی تو کہتی ہوں . . . یہیں تو پانی مرتا ہے . . .
اس نام کے دو آدمی . . . پھر میرے بچّے کا ذکر تھوڑا
ہی ہے . . ."

ہمسائی بولی "اللہ جانے کیا قصہ ہے۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں . . . اسی لیئے میں تم سے پوچھ رہی تھی . . . ہماری تو یہی دعا ہے کہ . . . وجہ یہ کہ تمہارا بیٹا ہوا تو پھر . . . اب لوگ یہی کہتے ہیں۔ کوپر کے ہاں بھی اسی نے چوری کی تھی . . . وہ ان دنوں سوفر بیک کی چوری ہوئی تھی نا۔ جب وہ ایسٹر پر گھر آیا ہوا تھا"۔

ماں تن کر کھڑی ہو گئی۔ مٹھیاں بند تھیں غصے کے مارے چہرہ ایسا پھیکا پڑ گیا تھا۔ گویا موت کی تصویر بن گئی ہے۔

"کسے یہ کہنے کا حوصلہ ہوا! . . . اس نے ہرگز چوری نہیں کی . . . ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں! . . . شرم نہیں آتی تمہیں؟ . . . ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ دنیا بھر کے الزام ہمارے سر تھوپ رہی ہو؟ . . . میرا ننھا دکھی لال! اچھی بات۔ ایک روز تم سب کو معلوم ہو جائے گا . . ."

نہ گھر کا دروازہ بند کیا۔ نہ بوٹ پہنے۔ بڑی تیزی سے قریب قریب بھاگتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کو چل دی۔

شہر پہنچی تو سات کا گھڑیال بج رہا تھا۔ ریل میں اس کے دلی خدشے کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئے۔ اب دل یہ نہ کہہ رہا تھا۔ "ناممکن ہے کہتی تھی "ہے۔ ہے۔ اور اگر سچ ہوا تو"؟ . . . معلوم ہوتا تھا۔ سفر کبھی تمام نہ ہوگا۔ گاؤں اور کھیت نظروں کے سامنے دیوانہ وار بھاگے چلے جارہے تھے۔ تار کے کھمبے یوں ابھرتے ہوئے نظر آتے۔ اور ڈوب جاتے۔ جیسے وہ ہنڈولے پر سوار ہو۔ جب ٹرین تھم گئی۔ تو وہ کانپنے لگی۔ اب معلوم ہو رہا تھا۔ کہ حقیقت معلوم ہو جانے کا وقت بہت جلد آگیا۔ منہ ہی منہ میں اوراد و وظائف دہرا رہی تھی۔ دعائیں خود بخود زبان پر چلی آ رہی تھیں۔ اور اُن کے ساتھ ساتھ وہ التجائیں بھی کرتی

جا رہی تھی :

"پاک مریم۔ تیرے ہوتے یہ ستم کیونکر ممکن ہے؟ نہیں ممکن ہے نا؟ . . . میری دکھ بھری دعاؤں کو سُن۔ جو میں تیرے حضور میں لائی ہوں . . ."

آہنی دروازے میں سے گذرنے کے بعد سامنے چوکور پارک نظر آئی۔ اس کے سامنے دُور دُور تک میدان پڑا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف سکون اور خاموشی تھی۔ سپاہی سیڑھیوں پر بیٹھے مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ بیٹے نے ماں کو مختلف عہدے داروں کی پہچان بنا دی تھی۔ وہ ایک سارجنٹ کے پاس آکر تھم گئی۔ بڑی عاجزی سے بولی :

"میاں سارجنٹ کھو گے تو۔ نہ جان نہ پہچان۔ پر مجھے ایک بات دریافت کرنی ہے۔ معلوم کرنا چاہتی ہوں . . . ؟"

گومگو کے عالم میں رُک گئی۔ اپنے شبہوں کے

اظہار کی جرأت نہ تھی:

"وہ یہ بات ہے۔ بات کیا ہوتی۔ اپنے بیٹے کا حال پوچھنا ہے ۔ ۔ ۔ پول مشون۔ تیسری رجمنٹ میں ہے نا؟ ۔ ۔ ۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ کہ ۔ ۔ ۔ بس یہ کہ میں اُس سے مل سکتی ہوں؟ ۔ ۔ ۔"

بڑھیا نے مسکرانے کی کوشش کی:

"میں اس کی ماں ہوں ۔ ۔ ۔ اس کی ماں ۔ ۔ ۔ نہیں؟ پر کیوں؟ ۔ ۔ ۔ کہاں ہے؟ ۔ ۔ ۔ بیمار ہے کیا؟ ۔ ۔ ۔ تو پھر کیوں نہیں؟ ۔ ۔ ۔ ہاں مجھے معلوم ہے ۔ ۔ ۔ نہیں مجھے تو خبر نہیں ۔ ۔ گرفتار ہو گیا؟ ۔ ۔ ۔ پولیس اسٹیشن پر ہے؟ ۔ ۔ ۔ قید میں ہے؟ قید میں؟ ۔ ۔ ۔ تم نے کیا کہا؟ ۔ ۔ ۔"

بڑھیا نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا

"پاک مریم پھر یہ سب کچھ سچ ہے! ہائے پاک مریم ۔ ۔ ۔"

لڑکھڑا لڑکھڑا کر قدم دھرتی ہوئی واپس چلی۔

تخفیف جرم کی وجہ

فوجی جیل سے معلوم ہوا۔ کہ بیٹے کو قید تنہائی میں رکھا ہوا ہے۔ اس تنہائی کے لفظ نے اس کے خدشوں کو بے حد بڑھا دیا۔ اس کے تصوّر میں آیا جیسے وہ اکیلا ہے۔ اور ہر ایک سے ہمیشہ کے لئے جُدا کر کے بند کر دیا گیا ہے۔ جکڑ دیا گیا ہے۔ وہاں لوگوں نے مشورہ دیا۔ کہ کسی وکیل سے جا کر مل۔ اُسی طرح لڑکھڑاتے قدموں سے ایک وکیل کے ہاں گئی۔ اور اُس سے ملی وکیل سے تمام معاملہ ٹھیک معلوم ہو گیا۔ اب کچھ شُبہ باقی نہ رہا تھا۔ لڑکے نے لُوٹنے کی نیّت سے کسی کو جان سے مار ڈالا تھا۔ مال مسروقہ تقریباً چھ سو فرنیک اُس کی توشک سے برآمد ہو گئے تھے۔ لڑکے نے اقبال جُرم کر لیا تھا بہتیرے آنسو بہائے۔ بیٹے سے مل لینے کے لئے منّتیں خوشامدیں کیں۔ مگر بے سود۔ مجبوراً گاؤں کو واپس چلی گئی۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ دل دھڑکتا تھا۔ کہ نہ جانے کوئی کیا کہہ دے۔ لوگوں سے نظریں

چار کرنے کے خیال سے دہشت ہوتی تھی۔ آدھی رات تک گھر میں داخل نہ ہوئی۔ اس مسکین جانور کی طرح جو مار سے ڈرتا ہے اور چھپ رہتا ہے۔ اب باہر آنے جانے کی بھی جرأت نہ پڑتی تھی۔ گھر کی کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیئے تھے۔ اخبار والا اخبار دروازے کے نیچے سے اندر ڈال جاتا۔ کانپتی کانپتی اسے اٹھا لیا کرتی۔ اخباروں سے اُسے نہ صرف اس جرم کی تفصیل معلوم ہوئی۔ بلکہ یہ اطلاع بھی ملی۔ کہ بیٹا ایک اور جُرم کا ملزم بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ شہادتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی معلوم ہوتی تھی۔ کہ اُس نے کوپر کے ہاں بھی چوری کی تھی۔ لیکن یہ . . . ہرگز نہیں۔ وہ قسم کھا سکتی تھی۔ یہ غلط تھا . . . لیکن آخر کار اسے اس میں بھی کچھ تامل ہونے لگا۔

جب مقدمہ ہونے کو آیا۔ تو پھر وکیل کے پاس گئی۔ اب اُس نے بیٹے سے ملنے کی درخواست نہ کی۔

خدا نہ کرے۔ کچھ اس لئے نہیں کہ بیٹے سے محبت ختم ہو چکی تھی . . . اُسے شرم سی آتی تھی . . .

"موسیو۔ وہ اس سے کیا سلوک کریں گے؟ آپ اُنہیں میرے بیٹے کو مجھ سے چھین کر تو نہ لے جانے دیں گے؟ . . . "

"بدنصیب عورت۔ مجھے تو ڈر ہے۔ وُہ اُسے لے جائیں گے . . . کاش تخفیف جرم کی کوئی وجہ نکل آتی۔ تو پھر سب کچھ ہو جاتا!"

"یہ کیا بات ہے؟ کوئی وجہ . . . اِس کا کیا مطلب ہُوا؟"

"اس کا مطلب ہے۔ کوئی ایسی بات۔ جو جج کی نظروں میں جرم کو گھٹا دے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو۔ کہ ایک شخص چوری کرتا ہے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اُس نے چوری اس لئے کی۔ کہ وہ بڑی غربت کی حالت میں تھا۔ اور اُس کے بال بچوں پر فاقے گذر رہے تھے۔ تو یہ بات تخفیف جرم کی وجہ بن جاتی ہے

اس معاملے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ پھر یہ لڑکے کا پہلا جرم بھی نہیں۔ وہ دوسری چوری۔ وہ پڑا نہ مانے۔ مگر اب جو بات ہے . . . تاہم جو کچھ ہو سکتا ہے۔ میں کروں گا۔"

فرانسوازاور بھی زیادہ ملول اور دل شکستہ ہو گئی۔ تخفیف جرم کی وجہ! ان لفظوں نے اس کے دل کو کرب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کس طرح سے کہاں سے کوئی ایسا بہانہ ملے۔ جس سے ججوں کے دل پر اتنا اثر ہو سکے۔ کہ وہ رحم اور عفو پر مائل ہو جائیں؟ . . . کوئی نہیں۔ اسے جرم کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کوئی چیز اس بھیانک واقعہ پر اثر نہ ڈال سکتی تھی۔

مقدمہ کا دن آیا۔ پھر گھر سے چل کھڑی ہوئی۔ ریل میں دعائیں مانگ رہی تھی۔ بزرگان دین کی دہائی دے دے کر ان سے امداد طلب کر رہی تھی۔ اور خالی دماغ میں وہی لفظ برابر گونج رہے تھے جنہیں بار بار دہرا چکی تھی۔ تخفیف جرم کی وجہ . . . تخفیف

جرم کی وجہ! . . .

دو گواہوں کے ساتھ ایک بند اور اندھیرے کمرے میں تصویر انتظار بنی کھڑی تھی۔ گواہوں نے اُسے موجود دیکھ کر آہستہ آہستہ گفتگو کرنی شروع کر دی جب اس کی باری آئی۔ تو وہ ڈگمگاتے قدموں سے عدالت کے اندر داخل ہوئی۔ صاف اور تیز روشنی میں اس کی پلکیں بار بار بند ہوتی اور کھلتی تھیں پل بھر میں نظر بیٹے پر پڑی۔ اس نے ایک رومال پر جس میں بڑے بڑے نیلے خانے بڑے تھے سر رکھا ہوا تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی مگر زور زور کی سسکیاں لے رہا تھا . . . بڑھیا تن کر کھڑی ہو گئی۔ اور جج سے نظریں ملائیں۔

اس نے خود شہادت دینے کی التجا کی تھی۔ لیکن اب حیرت کے عالم میں گم سُم کھڑی سوچ رہی تھی۔ کہ تو نے کیوں شہادت دینے پر اصرار کیا تھا؟ تجھے تو اس معاملے کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ۔

تجھے تو کچھ بھی نہیں کہنا۔ تو یہاں آئی کیوں؟ کوئی بھی تو وجہ نہیں۔ ہے تو بس یہ کہ تو اس کی ماں ہے۔ تو ہی نہیں جو اسے پیٹ میں لئے پھرتی تھی؟ تو نے ہی تو اس کے لئے دکھ درد سہے۔ اسے پالا پوسا... پروان چڑھایا... یہ تیرا۔ سب کا سب تیرا نہیں ہے؟ نہیں اب نہیں۔ آج یہ تیرا نہیں رہا۔

وہ تمام سوالوں کا جواب اشاروں کے ذریعے اور منہ ہی منہ میں کچھ بول کر دیتی رہی۔ عدالت میں غضب کا سناٹا طاری تھا۔ غریب دیہاتن سیاہ لباس پہنے غم کے مارے جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ جو کوئی اس کو دیکھتا۔ اس کا دل دُکھ کے رہ جاتا۔

جج نے پوچھا "یہ تمہارا اکلوتا بیٹا ہے؟"

"جی حضور"۔

"جب یہ تمہارے ساتھ رہتا تھا۔ تو تمہیں کبھی اس سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تھی؟"

"کبھی نہیں حضور"۔

"اس کے ملنے جُلنے والوں میں کوئی بدمعاش لوگ بھی تھے؟"

"کوئی نہیں۔ اس کے باپ کو سب لوگ بہت چاہتے اور اُس کی عزت کرتے تھے۔ وہ یہ کب گوارا کر سکتا تھا؟ . . . سب کے دل میں ہماری عزت تھی . . ."

"ہمیں معلوم ہے . . . ہمیں معلوم ہے"۔

پھر جج نے ملزم کی طرف رُخ کرکے کہا:

تمہیں بھی یہ معلوم تھا۔ اور اسی لئے تم نے اپنے والدین کی شہرت کی آڑ لے کر اُن دنوں کو چوری کے لئے مناسب سمجھا جب تم اپنی ماں کے پاس مقیم تھے . . . ایسے ایماندار لوگوں کے بیٹے پر کون شبہ کر سکتا ہے؟ . . . کوئی دوسرا ہو تو یہ کہہ سکتا ہے۔ اپنے جرم کا پورا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ میں ایسے لوگوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جو میرے سامنے بُری نظیر پیش کرتے تھے لیکن تم۔ تم اس قسم کا کوئی عذر نہیں کر

سکتے"۔

یہ سن کر بڑھیا بیتاب ہو گئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جو رو رو کر سُوج گئی تھیں۔ ایک عجیب قسم کی روشنی چمک اُٹھی۔ سر جُھکا ہُوا تھا۔ بغیر کسی قسم کا اشارہ کئے اچھی خاصی پرزور آواز میں بولنے لگی:

"موسیو مجھے معاف کرنا۔ اب مجھے معلوم ہُوا کہ سچ بولنے کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں۔ یہ دُکھی بچّہ گنہگار ہے۔ اِس نے بہت بڑا جرم کیا۔ ... لیکن یہ جرم اِس اکیلے نے نہیں کیا۔ ... ابھی ابھی مَیں نے کہا تھا۔ میری زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں جس پر مجھے لعن طعن کی جا سکے۔ ... میں نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ کوپر کے تین سو فرینک مَیں نے چرائے تھے۔ مَیں نے ... جب میرا پُول ایڈر میں گھر آیا۔ تو مَیں نے اسے بتا دیا کہ مَیں نے چوری کی ہے ... یہ غریب اتنا سُن کر سہم گیا ... بچّہ

یہی تو ہے . . . دیکھا کہیں ماں اپنی عزّت اور شہرت نہ گنوا بیٹھے . . . بس وہ روپیہ لوٹانے کو اور مجھے گرفتاری سے بچانے کو اس نے دوسری جگہ چوری کی . . . پکڑا گیا . . . ہوش حواس قائم نہ رہے . . . بغیر سمجھے بوجھے اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار بیٹھا۔"

بڑھیا کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ذرا دیر چُپ رہی۔ پھر مدھم آواز میں بولی:۔

"میں نے جھوٹ بولا تھا . . . میں بدمعاش عورت ہوں۔ میں نے اپنے بچّے کے سامنے بُری نظیر پیش کی . . . وُہ تو میں ہوں۔ جسے آپ کو گرفتار کرنا چاہئے . . . حضور یہ بات اس کے تخفیف جُرم کی وجہ ہو سکتی ہے؟ . . . مجھ کو بخش دیجئے . . ."

وہ اور بھی جُھک گئی۔ کندھے نیچے کو ڈھلک گئے۔ سر اور جُھک گیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ سکڑ کر نابود

ہو رہی جا رہی ہے۔

. . . لڑکے کی سزا عمر قید پر ٹل گئی۔ بڑھیا تمام گاؤں میں ہدف ملامت بن کر تھوڑے ہی عرصے میں مرگئی۔ گاؤں والوں نے رواداری میں نمازِ جنازہ ادا کر کے اُسے قبرستان کے سب سے دور کے حصّے میں دفنا دیا۔ ایسے کونے میں اس کی قبر بنائی۔ کہ سورج سر پر ہو۔ جب بھی گرجا یا صلیب کا سایہ اس تک نہیں پہنچنے پاتا۔

مَیں نے یہ کہانی اس کی قبر پر سُنی تھی۔ سیدھی سادی قبر تھی۔ اس پر کسی قسم کی آرائش نہ تھی۔ صرف سیاہ لکڑی کی ایک بوسیدہ صلیب نصب تھی۔ اور زنگ خوردہ دانوں کی ایک ٹوٹی پھوٹی اور مُڑی تُڑی تسبیح اوپر پڑی تھی۔ جس کے ساتھ ایک کاغذ پر یہ الفاظ لکھے تھے۔ جو مَیں نے پڑھ لئے۔

فرانسواز مِشون کو۔ اس جج کی طرف سے جس کے سامنے اُس کے بیٹے کا مقدمہ پیش ہُوا تھا"۔

اعتراف

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مگر میں ساکت و جامد کچھ دیر باہر کھڑا رہا۔ اور جیسے سوچتا رہا۔ کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں۔ جو بڑھیا مجھے بلانے کے لئے بھیجی گئی تھی۔ آخر جب اس نے دوسری مرتبہ کہا۔ "آجایئے" تو میں داخل ہو گیا۔

پہلے پہل مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ صرف ایک لمپ دکھائی دیا۔ جس پر اتنا لمبا فانوس تھا۔ کہ اس کی روشنی باہر نہ نکل سکتی تھی۔ پھر مجھے دیوار پر ایک ناتواں جسم کا بے حس و حرکت سایہ نظر آیا۔ تیکھے نقش کا کوئی دبلا

اعتراف

پتلا اور لمبا شخص تکیے پر ٹیک لگائے پڑا تھا۔ کمرہ جیسے پیٹرول اور اینتھر کی ہلکی ہلکی بُو سے بھرا ہُوا تھا۔ اور سکوتِ مزار طاری تھا۔ بس آواز تھی تو بارش کی جو پختہ چھت پر پڑ پڑ برس رہی تھی۔ یا ہوا تھی جو خالی آتش دان میں سے سائیں سائیں کرتی گذر جاتی۔

بڑھیا ایک جگہ جھکی تو مجھے معلوم ہُوا۔ وہاں پلنگ بچھا ہے۔ آہستہ سے بولی "موسیو! موسیو! آپ نے جس شخص کو بلوایا تھا آگیا۔۔۔"

سایہ دھیرے دھیرے اٹھا۔ اور ایک دھیمی آواز نے کہا:" اچھی بات۔۔۔ تم جاؤ۔۔۔ مجھے تنہائی چاہیئے۔۔۔"

بڑھیا نے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر دیا تو پھر مجھے آواز آئی:

"موسیو! اور قریب آجایئے۔ مَیں تقریباً اندھا ہو چکا ہوں۔ میرے کان شائیں شائیں کر رہے ہیں

کچھ سنائی نہیں دیتا۔ یہاں میرے پاس آکر بیٹھ جائیے+ دیکھئے کرسی رکھی ہوگی۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو آنے کی تکلیف دی۔ مگر کیا کرتا ایک بہت ضروری بات کہنی تھی ۔ ۔ ۔"

اُس نے اپنا چہرہ میری طرف جھکا رکھا تھا+ آنکھیں پھٹی پھٹی نظر آرہی تھیں۔ جیسے گھور رہا ہے+ بوڑھے شخص نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں رک رک کر مجھ سے پوچھا۔ تو آپ ہی آپ کا نپ اُٹھا+ پہلے یہ بتایئے۔ آپ موسیو ژیرلو ہی ہیں نا؟ میں موسیو ژیرلو پبلک پراسیکیوٹر ہی سے گفتگو کر رہا ہوں؟

"ہاں!"

اُس نے یوں آہ بھری۔ گویا سینے پر سے ایک بوجھ سا اُٹھ گیا ہے+

"تو آخر کار اب میں اعتراف کر سکتا ہوں ۔ میں نے جو رقعہ آپ کو بھیجا تھا۔ اُس میں اپنا نام پیر یر لکھ دیا تھا۔ لیکن میرا اصلی نام یہ نہیں ہے+موت

سر پر پہنچ چکی۔ اور اس نے میرا چہرہ بدل ڈالا۔ ورنہ شاید آپ مجھے پہچان بھی لیتے ۔ ۔ ۔ خیر ۔ ۔ ۔

"کئی سال ہوئے ۔ ۔ ۔ پر کچھ نہ پوچھئے۔

یہ سال کتنے لمبے تھے۔ کہ میں جمہوریت کی طرف سے پبلک پراسیکیوٹر مقرر ہوا تھا۔ میں اُن لوگوں میں سے تھا۔ جن کے متعلق دنیا کہا کرتی ہے۔ کہ ان کا مستقبل بے انتہا روشن نظر آرہا ہے۔ اور میں دل میں ٹھان بھی چکا تھا۔ کہ اپنے مستقبل کو روشن بنا کر رہوں گا اپنی قابلیت کا ثبوت دینے کے لئے مجھے صرف موقعے کا انتظار تھا۔ بہت جلد عدالت میں ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا۔ جس کی پیروی میرے سپرد کی گئی۔ اور مجھے موقعہ مل گیا۔ ایک چھوٹے سے شہر کا واقعہ تھا۔ پیرس میں اس قسم کا جرم ہوتا۔ تو شاید کوئی اس کا خیال بھی نہ کرتا۔ لیکن وہاں کے لوگوں میں اس سے عجیب سنسنی سی پھیل گئی۔ فردِ جرم لگ گئی۔ اور پڑھی گئی۔ تو مجھے معلوم ہوا۔ اس مقدمہ میں

خوب کش مکش ہو گی۔ ملزم کے خلاف جو شہادت تھی بڑی اہم تھی۔ لیکن اُس میں کوئی ایسی قطعی بات نہ تھی۔ جس سے لاجواب ہو کر ملزم اعترافِ جرم کر لیتے ہیں۔ یا اُس کے لگ بھگ بیان دے دیتے ہیں ملزم نے اپنی صفائی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کمرہ عدالت میں ایک تذبذب سا پیدا ہو گیا۔ اور حاضرین کے دلوں میں ملزم کے لئے دردمندی اور ہمدردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ آپ کو معلوم ہو گا۔ اس قسم کا احساس کس قدر قوی اور نتیجہ خیز ہوتا ہے "لیکن ایسی باتیں منصف کو متاثر نہیں کر سکتیں۔ مجرم نے جن باتوں سے انکار کیا تھا۔ میں نے ان سب کے جواب میں اُن مسلسل واقعات کو پیش نظر کر دیا۔ جن سے موقع کی شہادت پایۂ ثبوت کو پہنچتی تھی۔ میں نے مجرم کی زندگی کو سب کے سامنے کھول کے رکھ دیا۔ اس کی تمام کمزوریوں اور غلط کاریوں کو طشت از بام کر دیا۔ میں نے ججوں کے

سامنے پُرزور الفاظ میں جرم کا نقشہ کھینچا۔ اور جس طرح شکاری کتا شکاری کو لئے شکار تک جا پہنچتا ہے۔ مَیں نے ملزم کو مجرم ثابت کر کے اپنی تقریر ختم کردی۔ ملزم کے وکیل نے میری دلیلوں کا جواب دیا۔ اور مجھ سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنے بس کی کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی۔ . . . لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ مَیں نے عدالت سے مجرم کا سر مانگا تھا۔ اور حاصل کر لیا۔

"میرے دل میں شاید مجرم کے لئے درد تو پیدا ہوتا۔ لیکن اپنی فصاحت پر مجھے اس قدر ناز ہو رہا تھا۔ کہ اَور سب جذبات ہَوا ہو گئے تھے۔ ملزم کا مجرم ثابت ہو جانا قانون کی بھی فتح تھی۔ اور خود میرے لئے بھی نہایت عظیم کامیابی تھی۔

"جس صبح مجرم کو موت کی سزا ملنی تھی۔ مَیں اس کے پاس گیا۔ میرے سامنے انہوں نے اُسے جگایا۔ اور پھانسی کے تختے پر چڑھنے کے لئے تیار کیا۔ اس کے چہرے سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ کہ کیا سوچ

رہا ہے۔ یا کیا محسوس کر رہا ہے۔ لیکن اُس وقت اُس کے چہرے کو تکتے تکتے یک لخت میرا دماغ جیسے ایک کرب میں مبتلا ہو گیا۔ اُنھوں نے اس کے بازوؤں کو جکڑ دیا۔ اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ لیکن وہ صبر شکر سے سب کچھ برداشت کرتا رہا۔ مجھے اس سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت نہ پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ شاید اُس نے اپنی نظریں مجھ پر گاڑ رکھی ہیں۔ اور اُن سے ایک ایسی طمانیت برس رہی ہے۔ جو انسان سے بالاتر ہستیوں کا حصہ ہے۔ جب وہ قید خانے کے دروازے سے باہر آیا اور گلوٹین پر نظر ڈالی۔ تو دو بار چلّا کر بولا "میں بے گناہ ہوں"۔ جو لوگ نعرے لگا لگا کر اُسے بے عزت کرنے کے لئے آمادہ کئے گئے تھے۔ یک لخت چُپ ہو گئے۔ پھر اُس نے مُڑ کر مجھے دیکھا اور کہا "مجھے مرتا ہُوا دیکھ اور اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر!" وہ پادری اور اپنے وکیل سے گلے ملا۔ . . اس کے بعد ایسا

معلوم ہوا جیسے وہ خود بخود گلوٹین پر چڑھ گیا۔ اور اس عظیم لمحے میں جب وہ سر کو تختے پر رکھے منتظر تھا۔ کہ تیز لوہا اس کی گردن پر آ پڑے۔ اس کے ماتھے پر بل تک نہ تھا۔ اور میں وہاں ننگے سر کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا . . . معلوم اس لئے ہوتا تھا۔ کہ میں . . . مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میرے نزدیک تمام دنیا جیسے معدوم ہو چکی تھی۔

"بعد میں کئی دنوں تک میرے خیالات کچھ ایسے اُلجھے رہے کہ میں واضح طور پر یہ بھی نہ سمجھ سکا۔ آخر کس مصیبت نے یک لخت مجھے مفلوج سا کر دیا ہے۔ اُس شخص کی موت سے میرے تمام اعصاب جیسے ناکارہ ہو گئے تھے۔ میرے ہم پیشہ لوگوں نے مجھ سے کہا:۔

"پہلی مرتبہ ہمیشہ یونہی ہوا کرتا ہے"۔

"میں نے ان کے کہے پر یقین کر لیا۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا۔ کہ اس تمام اُلجھن کی ایک خاص وجہ

اعتراف

ہے۔ اور یہ وجہ شبہ ہے۔ بس جس وقت سے مجھے یہ خیال ہوا۔ میرا لطف اور آرام حرام ہو گیا۔ سوچئے نا۔ اگر کوئی منصف کسی شخص کا سر قلم کروا دے اور پھر یک لخت اپنے دل میں سے آواز سنے "اور اگر یہ شخص در اصل بے قصور ہوا؟" تو اس وقت اس کی کیا کیفیت ہو گی؟

"میں نے اپنی پوری طاقت صرف کر کے اس خیال کو اپنے دل سے دور کرنا چاہا۔ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتا۔ کہ یوں کہاں ہو سکتا ہے یہ لغو خیال ہے۔ میرے دل و دماغ میں جو کچھ بھی منطق اور توازن سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے اس سے تشفی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میری تمام دلیلوں کو یہ سوال لاجواب کر دیتا تھا۔ 'آخر وہ کونسا ثبوت ہے جس پر تم قطعی طور پر یقین کر سکتے ہو؟' اور پھر مجرم کی زندگی کی آخری گھڑیاں میری نظروں میں آجاتیں۔ میں اس کی صابر و شاکر آنکھوں کو دیکھتا۔ اور اس کی آواز سنتا

ایک روز اس کی موت کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ کہ کسی نے مجھ سے کہا:

"اس نے بڑی خوبی سے اپنی صفائی پیش کی تھی۔ تعجب ہے۔ کہ پھر بھی بری نہ کیا گیا۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ جو تقریر تم نے ججوں کے سامنے کی وہ نہ سنی ہوتی۔ تو ہم اُسے بے قصور ہی سمجھتے"۔

"گویا یہ میرے الفاظ کا سحر تھا۔ کامیابی حاصل کرنے کے لئے میری قوت ارادی کا خروش تھا جس نے اس تماشائی کے دل سے تذبذب دور کر دیا۔ اور ججوں کے دل پر بھی فتح حاصل کر لی۔ اس کی موت کا باعث صرف میں تھا۔ اور اگر وہ معصوم تھا۔ تو اس مہیب جرم کی تمام ذمہ داری مجھ پر آتی ہے"۔

"انسان جب تک اپنی صفائی کی تھوڑی بہت کوشش نہیں کر لیتا۔ اپنے ضمیر کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لئے زور نہیں لگا چکتا۔ اس طرح اپنے آپ کو مجرم قرار نہیں دے لیتا۔ چنانچہ جو شکوک مجھے

مفلوج کئے دے رہے تھے۔ اُن سے مخلصی پانے کے لئے میں نے از سرِ نَو اس مقدمے کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اپنے اشارات کو پڑھا۔ اور ضروری کاغذات کا دوبارہ معائنہ کیا۔ تو مجھے پھر اپنی پہلی رائے پر یقین کامل ہو گیا۔ لیکن یہ میرے لکھے ہوئے اشارات اور میرے تحریر کئے ہوئے کاغذ تھے۔ میرے دماغ کا نتیجہ تھے۔ جس نے غالباً پہلے سے تعصب کو دل میں جگہ دے لی تھی۔ میری خواہش نے ارادے کو مغلوب کر لیا تھا۔ میں چاہتا ہی یہ تھا۔ کہ اسے مجرم ثابت کروں۔ چنانچہ اب میں نے دوسرے نقطۂ نظر سے مقدمے کا مطالعہ شروع کیا۔ کہ کیا سوالات ملزم سے کئے گئے تھے۔ اس نے کیا جواب دیئے تھے۔ اور گواہوں کی شہادت کیا تھی۔ بعض امور جو ابھی قطعی طور پر واضح نہ ہوئے تھے۔ ان کے متعلق تشفی حاصل کرنے کو میں نے موقعہ اور آس پاس کی گلیوں اور گھروں کے نقشے

کا معائنہ کیا قاتل نے جس ہتیار سے کام لیا تھا۔ اسے
ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ بعض ایسے نئے گواہ معلوم کئے
جن کی شہادتیں نہ لی گئیں تھیں۔ یا جن کو دانستہ
نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یوں کوئی بیس ایک مرتبہ ان
نئی تفصیلات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر
پہنچا۔ کہ ملزم بے گناہ تھا۔ اور پھر اس وقت گویا
میرے انفعال کو اور زیادہ دردناک بنانے کے
لئے نہایت معقول ترقی مجھے پیش کی گئی۔ یہ میرے
جرم کا انعام تھی۔

" موسیو۔ میں نے بڑی بزدلی سے کام لیا۔
بغیر کوئی وجہ بیان کرنے کے استعفیٰ داخل کر دیا۔
اور سمجھ بیٹھا۔ کہ میں نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا
ہے۔ سفر کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ پر آہ! فراموشی
طویل سڑکوں کے دوسرے سرے پر نہیں ملا کرتی!
میری زندگی کا ایک اکیلا مقصد یہ رہ گیا۔ کہ جو ناقابل
تلافی جرم کر چکا ہوں۔ کسی طرح اس کا کفارہ ادا کر دیا

لیکن مجرم ایک آوارہ گرد شخص تھا۔ نہ اس کے اہل و عیال تھے نہ دوست . . . ۔ میں صرف ایک ہی بات کر سکتا تھا۔ وہی میرے شایانِ شان تھی، اپنی غلطی کا اعتراف کر لوں۔ لیکن مجھے حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ میں اپنے ہم پیشہ لوگوں کے غیظ و غضب اور نفرت و حقارت سے خائف تھا۔ آخر کار میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کفارے کے طور پر اپنی تمام پونجی اُن لوگوں کی امداد میں صرف کر دوں۔ جو آلام و مصائب میں گرفتار ہیں۔ خصوصیت سے ان لوگوں کو مدد دوں۔ جو مجرم ثابت ہو چکے ہیں . . . مجھ سے زیادہ کس کو حق حاصل تھا کہ مجرموں کو سزا سے بچانے کی کوشش کرتا؟ میں نے زندگی کی تمام خوشیوں کو بھلا ڈالا۔ آسائشیں اور راحتیں ترک کر دیں۔ آرام کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ یوں سب کی یاد سے نکل کر میں نے تنہائی میں زندگی بسر کی ہے۔ اور قبل از وقت ضعیف ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنی ضروریاتِ زندگی کو تخفیف کی

آخری حد تک پہنچا دیا ہے . . . مہینوں سے اس کمرے میں مقیم ہوں ۔ یہیں اس مرض کا شکار ہو گیا ۔ جو میری جان لینے والا ہے یہیں مر جاؤں گا ۔ یہیں مرنا چاہتا ہوں . . . پر موسیو ۔ اب میں یہ بتاتا ہوں کہ آپ سے میری کیا التماس ہے . . . "

اس کی آواز اتنی دھیمی پڑ گئی ۔ کہ الفاظ سمجھنے کے لئے مجھے اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنا پڑا :

"میں نہیں چاہتا کہ یہ داستان بھی میرے ساتھ تمام ہو جائے ۔ میری تمنا ہے ۔ تم اس کو سبق کے طور پر ان سب لوگوں کے لئے مشتہر کر دو ۔ جن کا فرض انصاف سے کام لے کر سزا دینا ہے ۔ تاکہ وہ محتاط رہیں اور سمجھیں کہ ہر حالت میں محض اس وجہ سے ان کا فرض سزا دینا نہیں ۔ کہ وہ اسی کام کے لئے مقرر کئے گئے ہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ جب احساس فرض پبلک پراسیکیوٹر کو مجبور کر رہا ہو ۔ کہ ججوں سے مجرم کی جان

طلب کرے۔ تو اس بات کا بھوت اس کی نظروں کے سامنے کھڑا ہو۔ کہ بعض باتوں کی تلافی بعد میں کسی طرح نہیں ہو سکتی"۔

میں نے اسے یقین دلایا "میں تمہاری فرمائش کی تعمیل کروں گا"۔

اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ ہانپ ہانپ کر کہہ رہا تھا:

"مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے . . . میرے پاس تھوڑا سا روپیہ باقی ہے . . . اب تک وقت نہ مل سکا۔ کہ اسے بدنصیبوں میں بانٹ سکتا۔ وہاں ہے . . . اُس الماری میں . . . چاہتا ہوں۔ میرے گذر جانے پر اُن کو دے ڈالو۔ پر میرے نام سے نہیں تیس سال ہوئے۔ میری غلطی کے باعث جو شخص جان سے مارا گیا تھا۔ اس کے نام سے . . . راناگلی کے نام سے اُسے خیرات کر ڈالنا"۔

میں چونک پڑا!

"رانا لی؟ اس کی پیروی تو میں نے کی تھی۔ اس وقت میں . . ."

اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

"میں جانتا ہوں۔ اسی لئے تم کو بلایا ہے۔ اس جرم کا اعتراف سننے کا حق تم ہی کو تھا۔ میں ویرونامی پبلک پراسیکیوٹر ہوں۔" اس نے اپنے ہاتھ چھت کی طرف اُٹھانے چاہے اور منہ ہی منہ میں بولا:

"رانالی . . . رانالی . . ."

تم کہو گے میں نے ایک ایسا راز افشا کر دیا۔ جو کسی قانون پیشہ شخص کی زبان سے نہ نکل سکتا۔ تمہارے نزدیک میں ان قواعد کی خلاف ورزی کا قصور وار ہوں۔ جن کا احترام ہر قانون دان کے لئے لازم ہے۔ لیکن میں مجبور ہو گیا تھا۔ اس لب مرگ انسان کی قابل رحم حالت دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں بے اختیار چلا اُٹھا:

"موسیو ویرُو! موسیو ویرُو! رانالی مجرم تھا

اعتراف

گلوٹین پر چڑھنے سے پہلے اُس نے خود مجھ سے اعتراف
کر لیا تھا۔ وہ جب مجھے خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ تو اس
وقت خود اس نے مجھے بتا دیا تھا . . . "
لیکن بوڑھا شخص اس سے پیشتر ہی تکیے پر
چاروں شانے چت گر چکا تھا . . . میں ہمیشہ اپنے
آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے الفاظ اُس
نے سُن لئے ہوں گے ٭

جب مٹّی کا آخری پھاؤڑا قبر میں پڑ چکا۔ اور میت برداروں سے آخری مصافحہ ہو لیا تو باپ بیٹے گھر چلے۔ آہستہ آہستہ اس طرح گویا ایک ایک قدم اُٹھانا دُوبھر ہے۔ دونوں کے دونوں گُم سم تھے۔ کیسے نہ ہوتے؟ عرصہ تک بساط سے بڑھ کر کوئی کوشش کی جائے۔ تو اُس کے بعد اسی قسم کا اضمحلال یک لخت آ لیا کرتا ہے۔

گھر ابھی تک پھولوں کی خوشبو سے بسا ہُوا تھا محشرستان بن چکنے کے بعد۔ آخری چند روز عیادت

کرنے والوں کا تانتا لگ جانے کے بعد اب پھر خاموشی برس رہی تھی۔ کچھ انوکھی طرح خالی خالی اور نیا نیا معلوم ہو رہا تھا۔ بوڑھی خادمہ ان سے پہلے گھر آ گئی تھی۔ اور سب چیزیں قرینے سے رکھ چکی تھی۔ باپ بیٹے پہنچے تو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے طویل سفر کے بعد واپس آئے ہوں۔ مگر وہ گھر لوٹ کر آنے کی خوشی کہاں؟ وہ اطمینان بھرا سانس کہاں؟ جس سے مراد ہوتی ہے۔ واہ وا! پھر اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر کیا مزا آتا ہے! . . . لیکن بظاہر سب کچھ جُوں کا توں تھا۔ آتش دان کے سامنے سر دُم میں دبائے بلی گیند سی بنی پڑی تھی۔ ہلکے ہلکے خُرخُر کر رہی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ سہانی دھوپ کھڑکیوں کے شیشوں پر چمک رہی تھی۔

باپ آتش دان کے قریب بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ سر ہلا کر آہ بھری۔ بولا:

"تمہاری ماں دُکھیا . . ."

دو آنسو بہ نکلے۔ گول گول محبت بھرا چہرہ جو شدتِ غم۔ راستے کی ٹھنڈ اور کمرے کی حرارت کی وجہ سے تمتمایا ہوا معلوم ہوتا تھا بھیگ گیا۔"

بلی خرخر کر رہی تھی۔ گھڑی ٹک ٹک کئے جاتی تھی۔ آتش دان میں لکڑیاں چیخ رہی تھیں۔ ذرا دیر میں ان آوازوں سے اُکتا گیا۔ کوئی مختلف آواز سننے کو جی چاہنے لگا۔ یا شاید دل میں اس قسم کی تسلی کا احساس موجود ہو۔ کہ دوسرے تو ہمیشہ کے لئے جا چکے۔ پر ہم آخر زندہ ہیں۔ بولنا شروع کر دیا:۔

"تم ڈوپلوں خاندان کے لوگوں سے ملے تھے؟ سب کے سب وہاں آئے تھے۔ اُن کے بوڑھے دادا کی تکلیف کرنے سے مجھ پر بڑا اثر ہوا . . . تمہاری ماں ان سب کی دیوانی تھی . . . کیا بات۔ تمہارا دوست بریاڈ نہ پہنچا؟ . . . کیا پتہ آیا ہی ہو۔ اتنی بھیڑ میں ہر ایک کہاں نظر آسکتا ہے؟ . . ."

پھر آہ بھری۔ بولا: "بدنصیب بچے"۔ . وگنی

باپ

اُلفت سے خیالات بیٹے کی طرف منعطف ہو گئے۔ بیٹا اچھا خاصا بڑا۔ پچیس سال کا نوجوان تھا۔ چُپ چاپ پاس بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں غم جھلک رہا تھا۔ نظریں آگ پر گڑی ہوئی تھیں۔

بوڑھی خادمہ آہستہ سے اندر آئی۔ ایسے آہستہ کہ اُس نے دروازہ بھی کھولا۔ تو نہیں معلوم نہ ہونے پایا۔

"اٹھو میاں۔ اب یوں یہاں بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں۔ تھوڑا بہت کچھ پیٹ میں ڈال لو"۔

دونوں نے سر اُٹھایا۔

سچ تھا۔ کچھ پیٹ میں بھی ڈالنا تھا۔ زندگی اُسی طرح چلنی ہے۔ کچھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ گئے گذرے دنوں کی پُر لطف بھوک نہیں۔ جب پُر تکلف دسترخوان پر بیٹھنے سے دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ ان جانوروں کی سی بھوک جن کے پیٹ میں آگ لگ رہی ہو۔ اب تک سوگواری کے

احساس نے انہیں روکے رکھا تھا۔ خادمہ بولی۔ تو دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ چاہتے تھے کہ کچھ کھا لیں۔ پر دل ہچکچاتا تھا۔ آمنے سامنے کیونکر بیٹھیں گے؟ گھر کے ایک آدمی کے کم ہو جانے سے پہلی مرتبہ دسترخوان کیسا اوپرا اوپرا معلوم ہوگا!

باپ کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔ آہستہ سے بولا:

"ہاں سچ کہتی ہو۔۔۔ کھانا اتار دو۔۔ چلو بھئی کچھ کھا لو۔۔۔"

لڑکے نے حامی بھرنے کو آہستہ سے سر ہلا دیا۔ اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"کوٹ بدلنا ہے۔ ابھی آتا ہوں۔"

باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ قدم خود بخود ماں کے کمرے کی طرف لے چلے۔ دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھا ہی تھا۔ کہ بوڑھی خادمہ آن پہنچی۔ آہستہ

سے بولی:

"موسیو ہین۔ ایک چیز آپ کو دینی ہے۔۔۔ خط ہے آٹھ دن ہوئے آپ کی اماں جان نے دیا تھا۔ اُس وقت اُن کو یقین ہو گیا تھا۔ اب اچھی نہ ہوں گی۔۔۔ انہوں نے کہا تھا۔ جب سب کچھ ہو چکے۔۔۔ تو آپ کو دے دوں۔۔۔ یہ رہا"۔

لڑکا ٹھٹک کر رہ گیا۔ اور حیرانی سے خادمہ کا منہ تکنے لگا۔ وہ اس کی طرف کچھ انوکھی طرح گومگو کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ میں لفافہ تھا کانپتی انگلیو سے تھام رکھا تھا۔ یک لخت لڑکے کو یقین ہو گیا کوئی بہت بڑا راز مجھ پر ظاہر ہونے کو ہے۔ یا کسی غم کا پہاڑ میرے سر پر ٹوٹنے والا ہے۔

گلا گھٹا جا رہا تھا۔ بولا:۔

"لاؤ۔۔۔" لے کر کمرے میں چلا گیا۔

معلوم نہ تھا کیا کر رہا ہے۔ پر دروازے کے تالے میں چابی گھما دی۔

باپ

کمرے سے یہ ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اُجڑ چکا اور ویران پڑا ہے۔ پلنگ پر بستر نہ تھا پردے کھنچے ہوئے تھے۔ آتش دان ٹھنڈا پڑا تھا۔ اسباب اس طرح رکھا تھا۔ گویا محض قرینہ مدِنظر ہے۔

کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ اور بے خبری کے عالم میں لفافے کو اُلٹتا پلٹتا رہا۔ مرحوم ماں کی زندہ تحریر دیکھ کر بھوچکا سا رہ گیا۔ کسی قدر مُڑے تُڑے لفافے پر اُسی محبوب خط میں الفاظ لکھے تھے۔ جس سے آنکھیں بخوبی آشنا تھیں۔ اتنا فرق تھا۔ ضعف کی وجہ سے حروف اُکھڑے اُکھڑے معلوم ہوتے تھے۔

اس کمرے اور ساتھ کے کمرے کے درمیان شیشے کی ایک دیوار تھی۔ جس پر پردا پڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف خادمہ کھانا لانے کے انتظام میں مصروف تھی اس کے آنے جانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

لڑکے نے لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا۔

باپ

"میرے پیارے بیٹے۔

"مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ میرا ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کا وقت آ پہنچا۔ جا رہی ہوں۔ مجھے نہ کوئی فکر ہے نہ غم۔ جانتی ہوں۔ اب تم جوان ہو۔ اور خاصی مدت میرے بغیر اپنی گذر کر چکے ہو۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔ کہ جو کچھ کسی ماں کے بس میں ہوتا ہے۔ میں نے تمہارے لئے اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن ہم دونوں کے متعلق ایک بہت بڑا راز ہے۔ کبھی جرأت نہیں پڑی کہ تم سے کہوں۔ لیکن تمہیں اس کی اطلاع دے دینا بہت ضروری ہے۔

"جس عورت سے تم اس قدر محبت کرتے رہے ہو۔ محبت تو محبت جس کی تمہارے دل میں اس قدر عزت ہے۔ جس کے پاس بچپن کی ایک ایک تکلیف بیان کرنے کو دوڑے آیا کرتے تھے۔ جس کے پاس جوانی کی الجھنیں لے لے کر آتے تھے۔ اُس عورت سے۔ میرے لال۔ تمہاری ماں سے ایک بہت بڑا

گناہ سرزد ہو چکا ہے . . . جس شخص کو اب تک تم اپنا باپ کہتے رہے ہو۔ تم اس شخص کے بیٹے نہیں*

"مجھے اپنی زندگی میں ایک مرتبہ بلا کی محبت ہوئی تھی۔ اور مجھ سے سب سے بڑا قصور یہ ہُوا۔ کہ میں نے اُس محبت کو چھپائے رکھا + تمہارا باپ۔ تمہارا اصل باپ زندہ ہے۔ تمہیں پروان چڑھتا ہُوا دیکھتا رہا ہے۔ تمہیں چاہتا ہے۔ اب تم خیر سے اتنی عمر کے ہو چکے۔ کہ زندگی کی بڑی بڑی باتوں کا فیصلہ خود کرو۔ چاہو تو اپنی زندگی کو بالکل بدل ڈالو۔ مجھے حوصلہ نہیں پڑا۔ تم میں حوصلہ ہو تو کل ہی امیر کبیر بن سکتے ہو + جانتی ہوں۔ میں جو کچھ اب کر رہی ہوں۔ اسے تم بُزدلی کہو گے . . . لیکن زندگی بھر اسی بُزدلی سے کام لے کر مرتے وقت میں پھر اور کیا کروں ؟ سینکڑوں مرتبہ میں نے ٹھان لی تھی۔ گھر سے نکل پڑوں گی۔ تمہیں ساتھ لیتی جاؤں گی۔ لیکن مجھے اتنی ہمت نہ پڑی۔

ایک ذرا سی بات مجھے ہمت دلا دیتی۔ مجھ پر ذرا سا شبہ ہوتا۔۔ ایک سخت لفظ سنتی۔۔۔ لیکن کبھی کوئی ایسی بات نہ ہونے پائی۔۔۔ کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہ ہوئی۔۔۔"

پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ اس انکشاف نے بے خود سا بنا دیا تھا۔

اس کی ماں اپنے شوہر کو برابر فریب دیتی چلی آئی تھی۔۔۔ اتنے برسوں تک دھوکے کی زندگی بسر کر گئی۔ اپنے گناہ کا پتہ دیئے بغیر۔ کسی قسم کے پچھتاوے کے بغیر وہ باتیں بھی کر لیا کرتی تھی مسکرا بھی لیتی تھی! اور وہ خود عورتوں کی کمزوری کو نفرت کی نظر سے دیکھتا آیا تھا۔ اس کی تمام خوشی۔ تمام ناز۔ احترام کے تمام جذبات ایک "ماں"۔۔۔ کے لفظ میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہ اس گھر میں ناخواندہ مہمان بن کر پروان چڑھتا تھا۔ اور جو شریف شخص ہمیشہ اس سے مہربانی اور الفت سے پیش آتا تھا۔ اس کے

باپ

لئے گویا ایک زندہ توہین تھا۔۔۔
بچپن کا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔
اُسے دکھائی دیا۔ میں پھر وہی ننھا سا بچہ ہوں۔
باپ کا ہاتھ تھامے سڑک پر چلا جا رہا ہوں۔۔۔ کچھ
بڑا ہوا۔۔۔ ایک سخت بیماری کا شکار ہو کر مہینوں
زندگی اور موت کے درمیان ڈانواڈول ہوتا رہا تھا
پھر باپ دکھائی دیا۔ پٹی سے لگا بیٹھا ہے مسکرانے
کی کوشش کر رہا ہے۔ پر آنکھ میں آنسو کھڑے ہیں
۔۔۔ وقت گذرتا چلا گیا۔۔۔ کاروبار کی مشکلات
آپڑی تھیں۔ اس کی یاد اور بھی زیادہ موثر تھی۔۔۔
اسے سونے کے لئے بستر پر لٹا دیتے۔ مگر یہ رات کو
چپکا پڑا باتیں سنتا رہتا ماں گم سم ہوتی۔ باپ کہتا۔
میں ہر ممکن طریقے سے حالت سدھارنے کی کوشش
کروں گا۔۔۔ تمباکو پینا چھوڑ دوں گا۔۔۔ میرے
کپڑے تو ابھی اچھے خاصے ہیں۔۔۔ کچھ بھی ہو۔
بچے کے لئے کسی چیز میں کمی نہیں ہونی چاہئے۔۔۔

بُرے دن بھی بیت جائیں گے . . . میں نے ہر طرح
کفایت شعاری سے کام لیا۔ تو اسے کچھ پتہ ہی کیوں
لگنے پائے گا . . . ان معصوموں کے لئے دکھ اُٹھانے
کو ابھی ساری زندگی پڑی ہے . . . بچپن میں ان
کا دل مَیلا کرنا ظلم ہے . . .''
ایسے شخص کو اس کی ماں نے فریب دیا تھا!
دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ رہا۔ خط کا
ایک فقرہ یاد آیا۔" اب تم خیر سے اتنی عمر کے ہو چکے
کہ زندگی کی بڑی بڑی باتوں کا فیصلہ خود کرو"!
سچ تھا۔ تمہیں تو کسی طرح پس و پیش کرنے
کا حق بھی حاصل نہیں۔ دولت کا تو خیال بھی دماغ
میں نہ گذرا تھا۔ یہ تو صرف اس بات کا سوال تھا۔
جو جرأت ماں کو نصیب نہیں ہوئی۔ بیٹے کو بھی حاصل
ہے یا نہیں۔ اس بات کا کچھ ذکر کئے بغیر۔ گھر سے
نکل جاؤ . . . کہیں دور چلے جاؤ۔ اور پھر کبھی لوٹ
کر نہ آؤ۔ اس طرح وہ کلنک جس کا اب علم ہو چکا ہے

تمہارے ساتھ ساتھ مِٹ جائے گا۔ اب دسترخوان پر کونسا منہ لے کر بیٹھ سکو گے؟ جب باپ بڑے پیار سے۔ "میرے بیٹے"۔ کہے گا بڑی محبت سے "دکھیا ماں" کا ذکر کرے گا۔ تو شرم کے مارے غرق غرق نہ ہو جاؤ گے؟

جو کچھ کرنا تھا۔ وہ تو ٹھان لیا تھا۔ پر سسکیاں نہ رکتی تھیں ؛

"ہائے ماں! ماں! یہ تم کیا کر بیٹھیں! . . . "

اب اس گھر کی محبوب زندگی کو۔ اس گھر کو جس میں روز شام کو لوٹ کر آنا ہوتا ہے۔ جو گئے گذرے دنوں کی مقدس یاد سے پاک ہے خیر باد کہہ دو۔ یوں فریب نہیں دیا جاتا۔ نہ دینا چاہیئے! دینے کا حق نہیں ؛

اپنے غمگین خیالوں میں کھویا ہوا ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ کہ کھانے کے کمرے سے آواز آئی۔

"ہا۔ بیچارہ بچہ . . . غریب کو کتنا صدمہ پہنچا ہے۔ . . . اپنی ماں کے کمرے میں بیٹھا ہے . . . یہی

چاہتا ہے۔ تو پھر بیٹھا رہنے دو۔۔۔ ہمارے تو دن ہی پھر گئے۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ میں بڈھا ہو گیا ہوں۔ بہت بڈھا ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔ میرا بچہ ابھی تک میرے پاس ہے۔ سعادت مند بچہ ہے مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جائے گا"۔

سر اٹھایا۔ ہونٹوں میں دانت گاڑ رکھے تھے دوسری طرف باپ باتیں کرتا رہا۔ سنتے سنتے اس کا خیال کہیں کا کہیں نکل گیا۔ جو کچھ اس نے ٹھان رکھا تھا۔ کچھ سہل نظر نہ آتا تھا۔ ٹھیک معلوم نہ تھا فرض کا کیا تقاضا ہے۔

"مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جائے گا۔۔۔"

تمہیں حق حاصل ہے۔ کہ اس بدنصیب شخص کو تنہا چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اور یہ اس اجڑے گھر میں۔ بے یار و مددگار روز بروز اور ضعیف ہوتا رہے؟ ۔۔۔ اس کی مسلسل مہربانیوں۔ محنتوں قربانیوں کا بدلہ اتارنے کے لئے بس اتنا ہی کر سکتے ہو۔ کہ یہاں سے

نکل جاؤ۔

لیکن تم اس شخص کی اولاد نہیں ۔ ۔ ۔ اس کے گھر میں رہنا مکروہ معلوم ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ کس طرح برداشت کیا جا سکتا ہے؟ ۔ ۔ ۔ پر جو کچھ بھی ہو ابھی فیصلہ کر لو۔ دیر کی تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا

ماں کا خط ابھی تک ہاتھ میں تھا۔ پھر پڑھنے لگا:" ایک ذرا سی بات مجھے ہمت دلا دیتی۔ مجھ پر ذرا سا شبہ ہو جاتا ۔ ۔ ۔ ایک سخت لفظ سنتی ۔ ۔ ۔ لیکن کبھی کوئی ایسی بات نہ ہونے پائی۔ کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہ ہوئی ۔ ۔ ۔"

شیشے کی دیوار کے دوسری طرف سے باپ کی آواز آ رہی تھی:۔

" ہاں۔ ستائیس سال اس کے ساتھ زندگی کاٹی اور اس تمام عرصے میں کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہ ہوئی۔۔۔"

وہی الفاظ تھے ۔ ۔ ۔ وہی فقرہ ۔ ۔ ۔

پھر خط کی طرف متوجہ ہو گیا:

باپ

"اب مَیں تمہیں تمہارے اصلی باپ کا نام بتاتی ہوں
اُس کا نام . . ."
لرزتی ہوئی انگلیوں میں خط کانپ رہا تھا۔ ورق
اُلٹ لیا۔ تو نام ہمیشہ کے لئے تمہاری آنکھوں میں۔
تمہاری روح پر نقش ہو جائے گا . . . اور پھر . .
پھر . . . تم کبھی . . .
ہلکی سی آواز پیار سے بلا رہی تھی:
"آؤ بھئی کھانا چُنا جا چکا . . ."
اس نے اپنا سر پیچھے کو ڈال دیا۔ اور ذرا دیر کو
آنکھیں بند کر لیں۔ پھر ایک دیا سلائی لی۔ ہاتھ اُٹھایا
اور خط کو آگ لگا دی۔ اسے آہستہ آہستہ جلتا ہوا دیکھتا
رہا۔ جب لپٹ ناخنوں تک پہنچی۔ تو انگلیاں کھول
دیں۔ چُر کو سیاہ خاک فرش پر گر پڑی۔ ذرا سا کونہ سفید
باقی تھا۔ خود جل کر تمام ہو گیا . . . کچھ باقی نہ رہا . . .
کھانے کے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ پل بھر اس
شخص کو دیکھتا رہا۔ جو اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس

کے حلیم چہرے پر محبّت برس رہی تھی ۔آنکھوں کے پپوٹے سُوجے ہوئے تھے ۔ ہاتھ کانپ رہے تھے ۔ بچّوں کی طرح اپنے ہاتھ اس کے جھکے ہوئے بازوؤں کے گرد ڈال دئیے ۔اس طرح لپٹ گیا۔ جیسے کوئی شخص آس ٹوٹ جانے کے بعد اپنے پیاروں سے ملتا ۔اور انہیں سینے سے لگا لیتا ہے ۔ آواز بھرّائی ہوئی تھی معلوم ہوتا تھا سسکیاں لے لے کر کہہ رہا ہے :۔

"ابا! میرے پیارے بوڑھے ابا!"

یوں ہی

واقعی، ہیں گو تے اپنے چہرے سے مجرم معلوم نہ ہوتا تھا۔

پستہ قد تھا۔ صحت کے اعتبار سے سدا کارد گی نظر آتا تھا۔ دیکھنے سے عمر کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ بُشرے سے ظاہر تھا۔ کہ مصائب کا قبل از وقت شکار ہو گیا ہے۔ عینک لگا رکھی تھی۔ جسے بار بار اضطراب سے ناک پر مناسب جگہ بٹھانا چاہتا۔ عینک کے شیشوں میں سے آنکھیں بے چینی سے حرکت کرتی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن ان میں مسکینی اور حلم کی جھلک تھی۔

اپنے انداز سے مجرم کی بجائے ایسا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہ ڈر ہو کہ کوئی جھڑک نہ دے۔

جرم کے وقوع ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی گرفتار کر لیا گیا تھا پر اُس نے اپنی صفائی کی کوئی کوشش نہ کی۔ پولس مین کا کندھے پر ہاتھ رکھنا تھا کہ اقبال جُرم کر لیا۔ بس اس وقت سے قریباً چُپ سادھ رکھی تھی۔

آخر کار جج نے پوچھا "تم اپنے جرم کی وجہ کیوں نہیں بیان کرتے؟ یہ تم کہہ چکے ہو کہ جس شخص کو قتل کیا ہے۔ اُسے جانتے نہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تم نے گھر میں سے کوئی چیز نہیں چُرائی۔ پھر آخر خون کرنے کی وجہ؟"

"کوئی خاص وجہ نہ تھی . . ."

"کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی ہی نا . . . کون کسی کے گھر جا کر بلا وجہ اُس کے سینے میں چھُری بھونک سکتا ہے؟ . . . آخر تم نے یہ حرکت کی کیوں؟"

"یوں ہی . . ."

"اس نے کسی طرح تم کو دکھ پہنچایا تھا؟ . . ."

یہ سُن کر مجرم نے کسی قدر پیچ و تاب کھایا۔ آنکھیں جھکالیں۔ یوں ہی بے معنی سا اشارہ کیا۔ اور منہ ہی منہ میں بولا:۔

"نہیں تو . . ."

لیکن پھر یک لخت اپنا لہجہ بدل کے کہنے لگا:۔

"ہاں دُکھ پہنچایا تھا . . . مَیں نے یوں ہی خون نہیں کیا . . . مَیں اب تک چُپ رہا ہوں۔ تو اس کا سبب محض یہ تھا۔ کہ مَیں نے شروع میں کوئی بیان نہ دیا تھا۔ اور پھر بعد میں کوئی بیان دینا میرے لئے بڑا مشکل تھا . . . بعض باتوں کا اعتراف کرنا بھی سہل نہیں ہوتا . . .

"مَیں ایسی اولاد ہوں۔ جو کسی کو اپنا باپ کہنے کا حق نہیں رکھتی؟ مجھے پروان چڑھانے کے لئے میری ماں کو چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہانا پڑتا تھا۔

یوں ہی

میرا بچپن خوشی سے یکسر محروم رہا . . . گھر میں ہر وقت آنسو بہتے دیکھتا۔ مدرسے میں سب مجھے حرامی کہہ کر پکارتے۔ پہلے پہل مجھے خبر نہ تھی۔ اس لفظ کا مطلب کیا ہے۔ لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا۔ کہ اس کے معنی بڑے افسوسناک ہیں۔ کیونکہ جب میں نے اپنی ماں سے اس کے متعلق گفتگو کی تو اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی قدرتی بات تھی۔ کہ میں نے اس کے سامنے پھر اس لفظ کو استعمال کرنے سے احتراز کیا۔ ادھر اس نے بستر مرگ پر پڑنے تک نہ کبھی کسی قسم کے شکوے کے لئے زبان کھولی۔ نہ مجھے اپنی داستان سنائی . . .
اس وقت میری عمر چودہ سال کی ہوگی۔

"چودہ برس کی عمر میں میں دنیا میں بے یار و مددگار رہ گیا۔ نہ کوئی عزیز تھا۔ نہ کوئی دوست۔ ابھی زندگی بسر بھی نہ کرنی شروع کی تھی۔ کہ اس سے تھک چکا تھا۔

"شروع شروع تو کسی بہت بڑی مصیبت کا سامنا نہ ہُوا۔ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں مجھے کھانے کو روٹی اور سونے کو بستر مل جاتا تھا . . . کبھی کبھار پہننے کو پھٹے پرانے کپڑے بھی دے دیتے تھے . . . اسی طرح برس گذرنے چلے گئے . . . بیس سال کا ہُوا۔ تو اپنی گذراوقات کے لئے اپنے ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت پڑی۔ اس وقت مجھے معلوم ہُوا غریبی کے کیا معنی ہیں . . . دو سال تک مجھے صرف پچیس فرینک ہفتہ وار پر بسر کرنی پڑی۔ مزدوری پیشہ تھا نہیں۔ تھوک فروشی کی ایک دُکان میں کلرکی کا کام کرتا تھا۔ اس لئے لباس بھی مناسب رکھنا نہایت ضروری تھا۔ لباس کی خاطر مجھے اپنا پیٹ کاٹنا پڑتا۔ دن بھر میں صرف ایک وقت روٹی میسر آتی۔ اور وہ بھی نپی تُلی . . . کئی بار سڑک پر چلتے چلتے میرا سر گھومنے لگتا۔ اور ایسا ضعف طاری ہو جاتا۔ کہ گرنے سے بچنے کے لئے کسی دیوار کا سہارا لینا پڑتا . . .

وجہ صرف بھوک ہوتی . . .

" ایک روز صبح کو دفتر میں پہنچا۔ تو دکان کے مالک نے مجھ سے کہا:۔

"تم جس طرح اپنے مفوضہ فرائض انجام دے رہے ہو۔ اس سے میں کچھ خوش نہیں ہوں۔ کچھ عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ تم بہت غلطیاں کرتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے دل لگا کر کام نہیں کرتے . . . پھر تمہیں اپنی ظاہری وضع کا بھی کچھ خیال نہیں۔ یہ بات مجھے ناپسند ہے . . . میں چاہتا ہوں میرے کلرک خوش پوش اور معزز آدمی نظر آئیں"۔ میرے کوٹ کے پھٹے ہوئے کناروں کو چھو کر کہا۔ "دفتر میں آنے کا یہ طریق مناسب نہیں ہے"۔

"میں نے عذر کرنا چاہا۔ پر اُس نے ایک نہ سُنی"۔

"بیہودہ! انسان چاہے تو کبھی یوں پھٹے حالوں نہیں رہ سکتا"۔

"وہ بول رہا تھا۔ اور دوسرے کلرک آجا رہے تھے۔ اس خیال سے کہ وہ بھی یہ گفتگو سن سکتے ہیں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرا تمام خون میرے دماغ میں موجیں مار رہا ہے۔ اس روز مجھے کھانے کو کچھ نہ ملا تھا۔

"پیٹ خالی ہوتا ہے۔ تو دماغ اپنا کام شروع کرتا ہے۔ میں ڈسک پر بیٹھا کام کر رہا تھا اور آنسو تھے کہ اُمنڈ اُمنڈ کر میری آنکھوں میں بھرے آ رہے تھے۔ میں بھوک اور شرم کے مارے روتا رہا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے مایوسی میں پہلی مرتبہ مجھے یہ خیال آیا۔ کہ جب میرا باپ ابھی تک زندہ سلامت موجود ہے۔ تو میں دنیا میں تنہا نہیں ہوں۔ آخر میں اس شخص کی اولاد ہوں۔ اس خیال سے میری کچھ تسلی ہوئی۔ اور ڈھارس بندھی۔ ارادہ کر لیا۔ کہ جا کر اُسے تلاش کرتا ہوں اپنی حالت بیان کروں گا۔ وہ متمول شخص ہے۔ جب اسے میرے

دیکھوں گا حال معلوم ہو گا۔ تو وہ غالباً ضرور میری امداد کرے گا۔ میں کیا اس کا بیٹا نہیں ہوں ؟

"اگلے روز میں نے اس کے مکان پر پہنچ کر دستک کی گھنٹی بجائی۔ میرے دل میں آپ سے آپ اس سے ایک لطیف سا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا" وہ پستہ قد۔ خمیدہ کمر۔ بوڑھا شخص تھا۔ چہرہ پیلا پڑا ہوا چال میں لڑکھڑاہٹ . . . ہر بات سے ظاہر۔ کہ مرض میں گرفتار اور مضمحل ہے۔ مجھ سے پوچھنے لگا :-

"تم کون ہو۔ کس کام کو آئے ہو؟"

"اس کی آواز کے لہجے سے جیسے میرا خون جم گیا۔ میں نے ہچکچاتے ہچکچاتے اپنے آنے کی وجہ بیان کرنی شروع کی۔ لیکن ابھی یہ مشکل گفتگو چھیڑی ہی ہو گی۔ کہ اس نے لرز کر قطع کلام کر دیا :

"اتنی اونچے نہیں . . . آہستہ آہستہ بات کرو . . کہیں کوئی سُن نہ لے :

"جتنی جلدی ہو سکا۔ اُس نے مجھ سے مخلصی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ گول مول باتیں کرتا ہوا مجھے دھکیلتا دھکیلتا دروازے تک لے آیا۔

"اپنا پتہ چھوڑتے جاؤ . . . سوچوں گا۔ کہ تمہارے لئے کیا کروں . . . ہاں سوچوں گا . . . بیمار ہوں . . . تمہیں لکھ بھیجوں گا . . ."

"میں اپنے منتشر خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوا گھر چل دیا۔

"ہفتہ بھر انتظار کیا۔ کوئی اطلاع نہ ملی۔ حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ کہ پھر اس کے پاس جاؤں۔ ڈرتا تھا کہ کہیں پھر سراسیمہ نہ ہو جائے۔ پر میں اپنے دل میں کہتا رہا۔ ایسا تھوڑا ہی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ مجھے فاقوں کے مارے مرجانے دے۔ اب میں نے اس کے مکان کے اردگرد پھرنا پھرانا شروع کیا۔ ہمسایوں سے بات چیت کرتا اور اپنا راز بچا کر جہاں تک ہوتا۔ ان سے معلومات حاصل کرتا رہتا۔

" ان میں سے ایک نے کہا، اگر اس آس میں
ہو۔ کہ اس کے دل پر کسی بات کا اثر ہو جائے۔ تو
بھیا اسی وقت اپنی ساری امیدیں توڑ ڈالو۔ اس کا
دل تو پتھر کا ہے۔ پتھر کا . . . ویسے اب اس
کی دولت بھی زیادہ عرصہ اس کا ساتھ نہ دے
گی۔ مرض نے ایسا گھیرا ہے۔ کہ چلنا پھرنا دوبھر
ہو گیا ہے . . . "
"میں نے ڈرتے ڈرتے یہ بھی پوچھ لیا۔ کہ
اس کے کوئی عزیز یا دوست بھی ہیں؟
"ہمسائے نے استہزا کے انداز میں کندھے
جھٹک کر کہا، دوستوں کی بھی ایک ہی کہی! رشتہ داروں
میں شاید ایک بھتیجے کا بیٹا فرانس کے کسی کونے
میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ پر اُسے کچھ نہیں ملنے کا
اس کی تمام جمع پونجی اس عورت کو ملے گی۔ جو پندرہ
سال سے اس کے گھر کا کام کر رہی ہے۔ وہ شیخیاں
تو اسی قسم کی بگھارتی ہے۔ کہتی ہے کہ کئی دفعہ

اس نے مجھ سے کہا۔ کہ مَیں اپنی پونجی میں سے پھوٹی کوڑی بھی اپنے کسی عزیز کو نہ دوں گا۔ ایسا احمق نہیں ہوں۔ کہ اپنی موت سے ان کے دن پھیر دوں بس جو کچھ ہے۔ سب تم کو ملے گا۔ تم آپ پوچھ سکتے ہو۔ کہ اب وہ گھڑیاں گن گن کر وقت گذار رہی ہوگی یک لخت میرے دل میں۔ اپنے باپ سے نفرت سی پیدا ہوگئی۔ کیا میری تمام مصیبتوں کا باعث ایک یہی شخص نہ تھا؟

"مَیں وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اور گلیوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ کچھ خبر نہ تھی۔ کہاں جا رہا ہوں۔ ایذا کے ایک احساس نے باقی تمام جذبات کو مٹا ڈالا تھا۔ اسی طرح شاید بہت دیر تک گھومتا رہا ہوں گا۔ یہاں تک کہ آخر بھوک کے مارے نڈھال ہوکر ایک ذلیل سے تنور پر جا پہنچا۔ میرا خیال ہے وہ تنور کہیں قسبیل کے قریب ہوگا۔۔۔ وہاں روٹی کی قیمت ادا کرچکا۔ تو میرے پاس ایک پائی

باقی نہ بچی۔ اور ابھی مہینہ ختم ہونے میں چھ روز باقی تھے! سوچتا تھا۔ خدایا میرا کیا حشر ہوگا؟ سوچ ہی میں تھا۔ کہ ہاتھ اُس چاقو پر جا پڑا۔ جس سے روٹی کاٹی تھی بلیا۔ پتلا اور نوک دار چاقو تھا۔ نہ جانے میں نے کیوں اُسے اُٹھا لیا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اسے اٹھا لیا۔

"میں اپنے متعلق کوئی عذر پیش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ جس سے میرا جُرم گھٹ جائے لیکن یہ واقعہ ہے کہ جیب میں پہلو کے پاس چاقو ہونے کے احساس نے میرا دماغ چکرا دیا . . . میں نے اس کا دستہ پکڑ لیا . . . اپنی انگلیوں پر اُس کی دھار کا امتحان کیا . . . پھر بغیر یہ معلوم ہوئے کہ کیسے اور کیوں پہنچا۔ دیکھا۔ کہ میں اپنے باپ کے مکان کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوں۔

"جو کچھ کر رہا تھا۔ اس کے متعلق میں نے اپنے دل میں کچھ غور و خوض نہ کیا تھا۔ بھیانک خیالوں سے

بھلا کون لڑ سکتا ہے۔ میں کچھ سوچ ہی نہ رہا تھا۔ سمجھتے بوجھتے ہوئے بغیر کسی قسم کے تامل کے میں نے مکان کے صحن کی گھنٹی دبا دی . . . دروازہ کھل گیا۔ زبان پر جو نام سب سے پہلے آیا۔ میں نے لے دیا . . . اندر میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔

"جب میں مکان کی اس منزل میں پہنچا۔ جس میں میرا باپ رہتا تھا۔ تو میں ٹھٹھک گیا۔ مبہم سے طریق پر اس بات کا کچھ احساس مجھے تھا۔ کہ کیا جنونی کام کیا چاہتا ہوں + سوچا اگر گھنٹی بجائی تو اتنی رات گئے کوئی دروازہ نہ کھولے گا۔ اگر آواز دی تو ہمسائے یہ دیکھنے کو باہر نکل آئیں گے۔ کہ کیا واقعہ ہے۔ مجھے پکڑ کر سیڑھیوں سے نیچے پھینک ڈالیں گے۔

"میں نے جیب میں اپنے گھر کے دروازے کی چابی کو ٹٹولا۔ اور اسے نکال کر چپکے سے دروازے کے قفل میں لگا دیا۔ بغیر کسی قسم کے کھٹکے کے چابی تالے میں چلی گئی . . . چوروں کی طرح اُسے بڑی

آسانی سے گھما لیا . . . کوئی چیز سرک گئی۔ دروازہ کھل گیا۔ یہ دیکھ کر کہ میرے گھر کی چابی اور اس گھر کے تالے کی چابی ایک ہی ہے۔ میں مبہوت رہ گیا۔ چند لمحوں تک اندھیرے میں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ پہلی دفعہ اپنے آپ سے پوچھا۔ کہ تو کیا کر رہا ہے؟

"اسی وقت مجھے قالین پر ایک روشنی کی شعاع نظر آئی۔ بڑی خاموشی سے میں نے ایک دوسرا دروازہ کھول لیا۔

"ایک شخص . . . میرا باپ . . . میری جانب پیٹھ کئے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا سر نہ اٹھایا۔ جس میز پر وہ سر جھکائے کچھ کام کر رہا تھا اس پر ہرے رنگ کا نیچے فانوس کا ایک لیمپ رکھا تھا۔ جس کی روشنی میز پر پڑ رہی تھی۔ باقی کمرے میں سائے سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ مجھے اس کا گنجا سر اور نحیف شانے نظر آ رہے تھے

سانس روک کر میں دبے پاؤں اس کے پیچھے جا پہنچا۔ اور پنجوں کے بل اونچا ہو کر دیکھنے لگا۔ کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ سیاہی چوس پر ایک بڑا کاغذ پڑا تھا۔ اس پر لکھا تھا:۔

یہ میری وصیت ہے

"اس کے نیچے تین سطریں خفی قلم سے لکھی تھیں۔

ہمسایوں نے جو باتیں کہی تھیں۔ میرے دماغ میں سے بجلی کی رفتار سے گذر گئیں۔ اور میری آنکھوں کے سامنے وہ حریص خادمہ آ گئی۔ جس نے اس مکان میں میری ماں کی جگہ کو غصب کر لیا تھا۔

" ایک وحشیانہ جنون میری رگ رگ میں دوڑنے لگا۔ میں کہ اس شخص کی اولاد ہوں۔ فاقوں کے مارے مرا جا رہا ہوں۔ اس وقت اس کے پہلو میں بھوک کا مارا کھڑا ہوں۔ اور یہ اپنے قلم کی چند جنبشوں سے یہ نفرت انگیز حرکت کر رہا ہے۔ اور اسے اٹل بنائے دے رہا ہے۔ میرے لئے کہ آخر

کا خون اسی کا گوشت پوست ہوں۔ اور افلاس میں دم توڑ رہا ہوں۔ ایک دمڑی ایک پھوٹی کوڑی نہیں . . . سب کا سب اسی بڑھیا ڈھدو کے لئے۔ جو اس کی موت کی انتظار میں گھڑیاں گن گن کر گذار رہی ہے . . . یہ ناممکن ہے . . . اس کے لئے یہ ستم روا رکھنا کسی طرح مناسب نہیں ہے . . . میں آگے جھک گیا۔ اور پڑھنے لگا :۔

"میں اپنی مملوکہ تمام . . . دولت۔ جائداد . . ."

"میں نے دانت پیسے شروع کر دئے۔ وہ بے انتہا مضطرب ہو کر چونک اٹھا۔ سر پھیرا۔ میرے چہرے کو دیکھا۔ جو اس وقت قطعی۔ بے حد مہیب ہو گا۔ چیخ اٹھا۔ اور پھر ایک اضطراری حرکت سے وہ کاغذ اپنی بانہہ سے چھپانا چاہا۔ تاکہ کہیں میں اسے پڑھ نہ لوں :۔

"چاقو میرے ہاتھ میں تھا ہی . . . میں نے
ایسی قوت سے کہ میری اپنی ہڈیاں چڑچڑ بولنے
لگیں۔ چاقو کا پھل اس کی گردن میں ہنسلی کی ہڈی
کے اوپر گھونپ دیا"۔

"اب مجھے احساس ہوا۔ کہ میں نے کیا کر دیا
ہے . . . میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا . . .
باقی باتیں آپ کو معلوم ہیں . . ."

اس نے عینک اتار لی۔ اور آنکھوں سے
آنسو پونچھے چہرے پر پسینے کی بوندیں بہ رہی تھیں
اور وہ کھڑا بڑی شدت سے کانپ رہا تھا۔

جج بڑے غور سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ اب
اس نے ایک لمبا چوڑا کاغذ کھولا۔ جس پر بھورے رنگ
کا ایک داغ پڑا ہوا تھا۔ بولا:۔

"اور اس کاغذ پر اور جو کچھ لکھا تھا۔ تم نے
نہیں پڑھا؟"

مجرم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر سنو۔ باقی میں تمہیں پڑھ کر سنا دیتا ہوں :-

یہ میری وصیّت ہے

میں اپنی مملوکہ تمام دولت جائداد اور سامان اپنے بیٹے بین گوسنے کے لئے چھوڑے جاتا ہوں اور اُس سے اس بات کی معافی چاہتا ہوں۔ کہ میں بُہت بُرا باپ . . .

"تم نے اسے وصیّت ختم کرنے کی مہلت نہ دی"؟

قاتل چونک کر کچھ سنبھل سا گیا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی سی تھیں۔ منہ کھلا ہُوا تھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا :-

"اپنے بیٹے کے نام . . . ؟ میرے ؟ . . . میں ؟ . . ."

ایک لمحے کو توقف کیا۔ پھر وحشیانہ انداز سے ایک قہقہہ لگایا۔ اس زور سے قہقہہ کہ چیخیں نکل نکل

گئیں۔ ساتھ ساتھ اپنا سر پیٹتا جاتا تھا اور جھوم جھوم کر غل مچا رہا تھا۔

"میں امیر ہوں! میں امیر ہوں!"

وہ پاگل ہو چکا تھا۔

شام پڑ رہی تھی۔ فقیر سڑک کے کنارے خندق کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی کونا کھدرا نظر آئے۔ تو وہاں پڑ کر رات بسر کر لے۔ اور رکوٹ سمجھ لو یا جو کچھ سمجھو۔ ایک بورا سا اُس کے پاس تھا۔ اُسی میں گھس گیا۔ لاٹھی کے سرے پر ایک گٹھڑی سی باندھ کر کندھے پر اُٹھا رکھی تھی۔ تکیے کی جگہ اسے سر کے نیچے رکھ لیا۔ تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ بھوکا تھا۔ پڑ رہا اور نیلے آسمان پر تاروں کو ایک ایک کر کے اُبھرتے

ہوئے دیکھنے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف جنگل بیابان پڑا تھا۔ پیڑوں پر چڑیاں نیند میں چُپ چاپ تھیں۔ دور بُہت فاصلے پر گاؤں ایک بُہت بڑا سیاہ دھبہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں سکون اور سناٹے میں لیٹے لیٹے غریب بڈھے کا دل بھر آیا۔

اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔ میرے ماں باپ کون تھے۔ لاوارث کو ثواب کمانے کے لئے کسی زمیندار نے لے لیا تھا۔ اُسی کے ہاں پروان چڑھا تھا۔ بچہ ہی سا تھا۔ تو وہاں سے نکل بھاگا۔ اِدھر اُدھر اِس فکر میں پھرنے لگا۔ کہ کہیں کچھ کام مل جائے جس سے روٹیوں کا سہارا ہو سکے۔ بڑی کٹھن زندگی گذاری تھی۔ دکھوں کے سوا جینے کا کوئی مزا نہ دیکھا تھا۔ جاڑوں کی لمبی لمبی راتیں چکّیوں کی دیواروں تلے پڑ کر کاٹ دی تھیں۔ سوال کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ذلت اُٹھائی تھی۔ چاہا تھا مر جائے۔

ایسی نیند سوئے۔ جس سے پھر کبھی آنکھ نہ کھل سکے۔
جتنے لوگوں سے اب تک واسطہ پڑا تھا۔ بے درد
تھے۔ شکی تھے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی۔
کہ معلوم ہوتا تھا۔ ہر ایک اُس سے ڈرتا ہے بچے
دیکھ پاتے تو بھاگ جاتے۔ کتے اُس کو چیتھڑوں
میں دیکھ کر بھونکنے لگتے۔

پھر بھی کبھی کسی کا بُرا نہ چاہا تھا۔ سیدھی سادی
اور نیک طبیعت پائی تھی۔ جسے مصیبتوں نے مردہ
بنا دیا تھا۔

آنکھ لگنے ہی کو تھی۔ کہ دُور سے گھنٹیوں کی
سی آواز آئی۔ جیسے کسی گھوڑے کی گردن میں ہل
رہی ہیں۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ تو زمین سے کچھ اوپر ایک
روشنی بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ شوق سے تکتا رہا۔ دکھائی
دے رہا تھا۔ کہ اچھا بڑا گھوڑا بھاری سی گاڑی
کو کھینچے لا رہا ہے۔ گاڑی پر اتنا لمبا چوڑا انبار لدا تھا
کہ سڑک نظر ہی نہ آتی تھی۔ گھوڑے کے ساتھ ساتھ

فقیر

ایک شخص مزے سے لے لے کر گاتا ہوا آرہا تھا۔
ذرا دیر میں گانا ختم ہو گیا۔ سڑک اوپر کو
چڑھتی تھی۔ گھوڑے کے سُم پتھروں پر کھٹا کھٹ
پڑ کر ان سے رگڑ کھانے لگے۔ گاڑیبان چابک مار
مار کر اور ہمت دلا کر گھوڑے کو بڑھنے کے لئے اکسانے
لگا۔

"چڑھا چل! . . . چڑھا چل!"
گھوڑے نے گردن آگے ڈال رکھی تھی۔ سر
پیر کا زور لگا رہا تھا۔ دو تین دفعہ رُکا۔ قریب قریب
گھٹنوں کے بل آ رہا۔ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اتنا زور لگایا۔
کہ سارا جسم عرق عرق ہو گیا، بے دم ہو کر رہ گیا۔
گاڑی تھم گئی۔
گاڑیبان نے ہاتھ دُھرے پر رکھ کر کندھا
پہیے سے ملا لیا اور زور سے کہا۔
"چل چڑھا چل . . . چال!"
گھوڑے نے بتیرا زور لگایا۔ گاڑی نہ ہلی۔

فقیر

"چڑھ چل۔ چڑھ۔ ۔ ۔ اوپر۔ ۔ ۔"

جانور نے ٹانگیں کھول رکھی تھیں۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔ جما کھڑا تھا۔ بوجھ اس قدر لدا ہوا تھا۔ کہ ڈر تھا۔ کہیں کھینچ کر پیچھے ہی نہ لے جائے۔ اگلے سُم زمین پر جمار کھے تھے۔ اتنا زور لگایا تھا۔ کہ بدن کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ گاڑیبان پہیے پر جُھکا ہُوا تھا۔ نظر فقیر پر پڑ گئی۔ کہ خندق کے کنارے بیٹھا ہُوا ہے۔ اسے آواز دی "بار ذرا ہاتھ لگانا۔ جانور کسی طرح سرکتا ہی نہیں۔ آئیو تو ذرا مل کر زور لگا۔ مَیں!"

فقیر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ زور کہاں تھا؟ تاہم اپنی بساط کے موافق گاڑی کو دھکیلنا چاہا۔ اور گاڑیبان کے ساتھ مل کر کہنا شروع کیا:۔

"اُدپر! اوپر! ۔ ۔ ۔"

بے سود!

تھوڑی دیر میں خود فقیر بے دم ہو گیا۔ ادھر جانور پر بھی ترس آرہا تھا۔ بولا۔

نفیر

"ذرا کی ذرا اِسے دم لے لینے دو۔ اتنا بوجھ اُٹھانے کی سکت اس میں نہیں ہے"۔

"نہیں بے یار۔ جی چراتا ہے۔ آج اس کی ہٹ پوری کردی۔ تو پھر بوجھ لے کر یہ کبھی چڑھائی پر نہ چڑھا، چل اوپر اچال یا۔۔۔ پہیئے کے نیچے ایک پتھر پھنسا کر رکھ دو۔ سڑک پر ادھر اُدھر موڑ کر چلائیں گے۔۔۔"

نفیر ایک بھاری سا پتھر اُٹھا لایا۔

گاڑیبان نے کہا" اس طرح۔ لو اب میں تو پہیئے پر زور لگاتا ہوں۔ چابک تم سنبھال لو۔ یوں کرو کہ اس کا سر بائیں ہاتھ موڑ کر چابک زور زور سے ٹانگوں پر رسید کرو۔ ابھی ہوش ٹھکانے پر آ جائیں گے"۔

درد سے بے تاب ہو کر گھوڑے نے پورے زور سے آگے بڑھنا چاہا۔ سڑک کے پتھر اس کے پیروں میں کچلے گئے اور ان سے چنگاریاں نکل پڑیں۔

فقیر

"یوں! اس طرح!"
گھوڑا سڑک پر ایک طرف مُڑ جانے کی کوشش
کر رہا تھا۔ گاڑیبان جھک کر چاہتا تھا۔ کہ پتھر کو
ٹھیک پہیئے کے نیچے جما دے۔ کہ پاؤں رپٹ گیا
گھوڑا پیچھے کو ہٹا۔ گاڑیبان چیخ مار کر گر پڑا۔
پیٹھ کے بل گرا تھا۔ درد و کرب نے چہرے
کی کیفیت بدل ڈالی تھی۔ آنکھوں کے ڈھیلے اُبلے
پڑ رہے تھے۔ دونوں کہنیاں زمین میں گاڑ رکھی تھیں
اور مضبوط ہاتھوں سے پہیئے کو تھامے ہوئے تھا۔
کہ کہیں سینے پر سے نہ گذر جائے۔
بے حد اذیت سے بیتاب ہو کر چلایا۔ "آگے
بڑھاؤ۔ آگے بڑھنا۔ پچھلے دے رہا ہے..."
دیکھے بغیر صرف بوجھ کر کہ کیا ہو گیا ہے۔
فقیر نے چابک اور راس سے گھوڑے کو سنبھالنے
کی کوشش کی۔ لیکن مجبور جانور گھٹنوں کے بل
گر پڑا۔ زمین پر لوٹ گیا۔ گاڑی آگے کو اُچھل گئی

بم زمین پر آپڑے۔ لالٹین اُلٹ کر بجھ گئی۔ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں یا گھوڑے کا تیز تیز سانس سنائی دے رہا تھا۔ یا ایک شخص کے کراہنے کی دبی ہوئی آواز تھی۔

"آگے چل ... آگے چل ..."

کسی طرح گھوڑے کو کھڑا کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ تو فقیر دوڑ کر گاڑیبان کے پاس آ گیا۔ اور اس کے چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر پہیے نے اُسے بہت بُری طرح پھنسا رکھا تھا۔

گاڑیبان نے انتہائی کوشش سے پہیے کو اپنے جسم سے انچ دو انچ اوپر اٹھا رکھا تھا۔ ذرا کہیں پہیا ہاتھ سے نکل جاتا۔ ذرا طاقت جواب دے دیتی۔ تو کچلے جانے سے کام تمام تھا... اپنی حالت کو خود اچھی طرح سمجھتا تھا۔ فقیر کو اپنے اُوپر جُھکا ہوا دیکھا۔ تو چلّا کر کہا۔

"مجھے نہ چھونا! مجھے نہ چھونا... دوڑ کر

فقیر

گاؤں کو جاؤ۔ ۔ ۔ جلدی۔ میرے ماں باپ کے گھر۔ ۔ ۔ لُوشتات کے گھر۔ ۔ ۔ دائیں ہاتھ جو مکان اور کھیت پہلے پڑتے ہیں۔ ۔ ۔ کہنا مدد لے کر آئیں ۔ ۔ ۔ دس منٹ تک یوں ہی پڑا رہ سکوں گا۔ ۔ ۔ جلدی۔ ۔ ۔ ؟

فقیر پُورے زور سے چڑھائی پر بھاگا۔ ہوا کی طرح اُس گاؤں میں جا گھُسا۔ جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیاں بند تھیں۔ روشنیاں گُل ہو چکی تھیں۔ کہیں کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ گذرا تو کتے زور زور سے بھونکنے لگے۔ پر وہ نہ کچھ سن رہا تھا۔ نہ دیکھ رہا تھا۔ بس دماغ میں اس شخص کی ہیبت ناک تصویر جمی ہوئی تھی۔ جو پہاڑی کے نیچے پڑا تھا۔ اور اُس بھاری بوجھ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ جو اُسے کچلنے کے لئے بڑھا آ رہا تھا۔

آخر کار وہ تھم گیا۔ سامنے دور تک سڑک ہموار دکھائی دے رہی تھی۔ دائیں ہاتھ صحن کے

پیچھے ایک عمارت کھڑی تھی۔کھڑکی میں سے تھوڑی تھوڑی روشنی باہر نکل رہی تھی۔سمجھا یہی وہ گھر ہوگا مٹھیوں سے دروازے کے پٹ پیٹنے لگا۔

ایک آواز آئی:۔

"تم ہو نول؟"

دوڑنے کی وجہ سے دم پھول رہا تھا۔آواز نکلتی نہ تھی۔کہ جواب دیتا۔کیا کرتا۔دروازہ پیٹتا رہا پلنگ کی چرخ چوں سے معلوم ہوا۔کہ کوئی شخص اٹھا پھر قدموں کی آواز آئی۔کھڑکی کھلی۔اس کی روشن چوکھٹے میں کسی نیند کے ماتے کا چہرہ نظر آیا۔

"تم ہو نول؟"

سانس کچھ کچھ درست ہو چلا تھا۔ہانپتے ہوئے کہا۔"نہیں پر میں اس لئے آیا ہوں۔کہ . . .

زمیندار نے فقرہ ختم نہ کرنے دیا۔بولا:

"غارت ہو کم بخت۔آدھی رات میں لوگوں کو بے آرام کرتا پھر رہا ہے"۔

فقیر

ڈن سے کھڑکی بند کرلی۔ اندر کسی سے کہا۔

"یوں ہی کوئی آوارہ گرد ہے۔ . . لُچا شُہدا۔ . ."

زمیندار کی درشت اور کرخت آواز سے فقیر کچھ کھویا سا گیا۔ اور گُم سُم رہ گیا۔ سوچا۔

"جانے اِنہوں نے مجھے کیا بھکاری سمجھا؟ مَیں نے انہیں کچھ نقصان پہنچایا تھا؟ . . . اتنا ہی قصور ہُوا تھا۔ کہ کچّی نیند سے جگا دیا؟ . . . ہائے کم بختو۔ کاش تمہیں کچھ معلوم ہوتا!"

پھر آہستہ سے کواڑ کھٹکھٹائے۔

اندر سے آواز آئی:

"ابھی تک یہیں ہے؟ . . . ذرا ٹھہر تو تو! اُٹھ کھڑا ہُوا۔ تو چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔"

فقیر کا سانس اب سنبھل گیا تھا۔ کچھ ہمت بڑھی بولا۔

"کھڑکی کھولو!"

"چلتا پھرتا نظر آ!"

فقیر

"کھڑکی کھولو!"

اب کے کھڑکی کھلی۔ مگر ایسی یک لخت اور اس زور سے کہ کواڑ کی زد سے بچنے کے لئے فقیر کو جھٹ اُچک کر پرے ہٹ جانا پڑا۔ زمیندار بندوق ہاتھ میں لئے غصے سے بھرا کھڑا تھا۔

"کنگلے کان کھول کر سن لے۔ اسی وقت یہاں سے دُور نہ ہُوا۔ تو تولہ بھر سیسہ سینے کے پار کر دونگا۔"

اندر بستر پہ پڑی پڑی کوئی عورت کہہ رہی تھی :-

"اجی تم چلا بھی دو بندوق . . . سب کی دعائیں لو گے۔ کم بخت آوارہ گرد کہیں کے جو سوائے چوری کے کوئی ہنر جانتے ہوں . . . اور ایک چوری ہی کا کیا ذکر . . ."

بندوق کو سامنے دیکھ کر فقیر سہم گیا۔ اور پیچھے اندھیرے میں چلا آیا۔ کانپ اٹھا۔ ذرا سی دیر کو اس کم نصیب کا خیال بھی دل سے نکل گیا۔ جو

فقیر

شاید عین اُسی وقت سڑک پر پڑا دم توڑ رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کا دل نہایت تیز و تند غصّے سے تڑپ اُٹھا اب تک اُسے کبھی معلوم نہ ہُوا تھا۔ کہ لوگ مجھ سے اتنے متنفّر ہیں۔ اس قدر گریز کرتے ہیں ؛

اور اگر تو فاقوں سے مر رہا ہوتا۔ تو نے ذرا سے ٹھکانے کی تلاش میں دروازہ کھٹکھٹایا ہوتا ؟ تجھے اتنا بھی حق حاصل نہیں۔ کہ تو ڈھور ڈنگروں کے قریب پھونس کے ڈھیر کو بستر سمجھ سکے؟ کتّوں کے ساتھ روٹی کا ایک ٹکڑا حلق سے اُتار سکے؟ . . . امیر تیری جان لینے پر بھی تُل سکتے ہیں؟ پھر کیا ان چیتھڑوں میں جو جسم پوشیدہ ہے۔ وہ انسان تک کہلانے کا مستحق نہیں؟ . . . غیظ و غضب کی ایک تیز لہر اُس کے تمام جسم میں دوڑ گئی ؛

پہلے تو جی بے تاب ہو گیا۔ کہ لاٹھی اُٹھا کر کھڑکی پر دے مارے۔ پھر خیال آیا "میں نے دوبارہ کھٹکا کیا۔ تو وہ فیر کر دے گا . . . شور و غل مچاؤں تو

سارا گاؤں جاگ جائے گا۔ اور میں اپنا مطلب زبان پر بھی نہ لانے پاؤں گا۔ کہ لوگ مجھے مار مار کر ادھ مُوا کردیں گے ۔ ۔ ۔ کہیں اور جا کر مدد مانگی۔ تو وہاں بھی یہی صورت پیش آئے گی ۔ ۔ ۔"

تھوڑے سے پس وپیش کے بعد وہ نہایت تیزی سے واپس چل دیا۔ کہ بلا امداد اپنے ذرا سی دیر کے دوست کی جان بچائے۔ دیوانوں کی طرح چلا جا رہا تھا۔ یہ خوف اُڑائے لئے جاتا تھا۔ کہ نہ جانے اب تک پیچھے کیا ہو چکا ہو۔ ۔ ۔ وہاں پہنچ کر کیا کچھ دیکھنا پڑے۔

اِس دہشت نے اُس کی ٹانگوں کو جوانوں کی سی قوت بخش دی تھی۔ ذرا سی دیر میں اس جگہ کے قریب آپہنچا۔ جہاں گاڑی تھم گئی تھی۔ چلّا کر کہا:۔

"دوست!"

کوئی آواز نہ سنائی دی۔ پھر چلّایا۔

"دوست!"

اس غضب کی تاریکی تھی۔ کہ گھوڑا تک نہ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن ہلکی ہلکی سی ہنہناہٹ کی آواز سن کر وہ آگے بڑھا۔ جانور اس سے چند قدم کے فاصلے پر ابھی تک کروٹ کے بل پڑا تھا۔ اور گاڑی آگے کو اُلٹی ہوئی تھی۔

"دوست! دوست!"

نیچے جُھک گیا۔ ذرا سی دیر بعد چاند بادلوں میں سے نکل آیا۔ دیکھا کہ گاڑیبان چت پڑا ہے۔ بازو یوں پھیلے ہوئے ہیں۔ کہ صلیب کی تصویر نظر آ رہا ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ منہ سے خون جاری ہے۔ پہیّا بوجھ کے مارے یوں سینے میں پیوست ہے۔ جیسے کسی نالی میں پھنس گیا ہو۔

غریب کی حالت تک مسخ ہو چکی تھی۔ اب یہاں کیا کرتا۔ ماں باپ کے خلاف غم و غصّہ پہلے سے زیادہ تیزی و تندی کے ساتھ بھڑک اُٹھا۔ انتقام کی پیاس سے تمام بدن پھنکنے سا لگا۔ دوڑا ہوا گاؤں

فقیر

میں واپس گیا۔ اب بندوق کا کچھ ڈر نہ تھا۔ دل میں کوئی جذبہ ہی نہ تھا۔ کواڑ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اور دل پر فقط ایک وحشیانہ خوشی مسلط تھی۔

"تم ہو پولی؟"

کچھ جواب نہ دیا۔ جب کنڈی کھلی۔ زمیندار کا چہرہ نظر آیا۔ اور پھر سوال سنائی دیا۔ تو وہ بولا۔

"نہیں۔ میں وہ کنگلا ہوں۔ جو تھوڑی دیر پیشتر تمہیں اطلاع دینے کو آیا تھا۔ کہ تمہارا بیٹا سڑک پر پڑا دم توڑ رہا ہے"۔

ماں اور باپ کی دہشت زدہ آوازیں سنائی دیں۔ "کیا کہا؟ ۔ ۔ ۔ کیا کہا؟ ۔ ۔ ۔ اندر آؤ ۔ ۔ ۔ چلے آؤ۔ چلے آؤ!"

لیکن فقیر نے ٹوپ آنکھوں کے اوپر کھینچ لیا اور یہ کہہ کر چل دیا:

"اب مجھے اور کام ہیں ۔ ۔ ۔ اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ وقت گذر چکا۔ جلدی سے اس

وقت کام لینا تھا۔ جب میں پہلی مرتبہ آیا تھا، اب تمام بوجھ اُس کی پسلیوں میں گڑ چکا ہے"۔

عورت سسکیاں بھرتی ہوئی بولی "پُوں کے ابا۔ جلدی کرو جلدی دوڑو!"

باپ نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، ساتھ ہی چلّا کر پُوچھا "وہ کہاں ہے؟ . . . سُننا . . . واپس آؤ . . . خدا کا واسطہ بتانا! . . ."

لیکن فقیر لاٹھی کندھے پر رکھے اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔

کوٹھی پر سے صرف ایک مُرغ کی اذان سنائی دی۔ جو آوازیں سُن کر جاگ گیا تھا۔ یا ایک کُتّے کی بھوں بھوں جس نے اپنا سر اُٹھا کر اور چاند کو دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

وہ بدمعاش میروں

یہ بات کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ کہ یہ عورت
جو نہ جوان ہے نہ حسین۔ کیونکہ میروں کے دل۔
دماغ اور اس کی تمام زندگی پر قابو پا کر اس کی اکیلی
مالک بن بیٹھی ہے۔ اس سے ملاقات ہونے کی
دیر تھی۔ کہ اس نے اپنے بہترین دوستوں سے قطع
تعلق کر لیا۔ مرغوب ترین مقامات میں جانا ترک
کر دیا۔ پہلے محض فن کا کمال ظاہر کرنے کو مصوری
کیا کرتا تھا۔ اب ارذل ترین تصاویر بنانے لگا۔
ایک مرتبہ ایک شخص نے جو کسی زمانے میں اس کا

بڑا گہرا دوست رہ چکا تھا۔ جرأت سے کام لے کر اُس سے کہا بھی۔

"ہیروں۔ تم تو نرے احمق بن گئے ہو۔ اپنا انداز خاص روز بروز بگاڑتے چلے جا رہے ہو۔ اپنی تمام خداداد قابلیتوں پر پانی . . ." اُس نے جواب میں بے پروائی سے بازو جھٹک کر کہا۔

"ہوُں۔ واہیات!" جب دوست نے اصرار کیا۔ اُس زمانے کی یاد دلائی۔ جب ہیروں شہرت کے خواب دیکھتا اور دل لگا کر کام کیا کرتا تھا۔ اور جب اس کا کمال دیکھ کر اُس کی ذات سے طرح طرح کی توقعات وابستہ ہو جاتی تھیں۔ تو وہ برا فروختہ ہو گیا۔

"میری قابلیت؟ میرے خواب؟ کیسی ہنسی کی باتیں کرتے ہو۔ جب ان امیدوں میں محو رہتا تھا۔ اُس زمانے میں مجھے رات بسر کرنے کو ٹھکانا تک نصیب نہ تھا۔ دن میں ایک وقت

روٹی میسر آتی تھی۔ میں جانتا ہوں۔ لوگ اب یہ کہنا ضرور چھوڑ دیں گے۔ کہ دیکھ لینا۔ یہ کسی روز امیر کبیر بن جائے گا۔ پڑے چھوڑ دیں۔ مجھے پیٹ بھر کھانا تو مل رہتا ہے۔ مالی پریشانیوں سے تو محفوظ ہوں۔ بس میں اتنے ہی سے خوش ہوں۔ بڑا خوش ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی قدم اٹھا کر رخصت ہو گیا۔ لیکن جب اُسے یقین ہو چکا۔ کہ اب میں نظروں سے اوجھل ہوں۔ تو ایک کیفے میں ٹھہر گیا اور ایک خالی گلاس سامنے رکھے گھنٹوں خیالات میں غرق بیٹھا رہا۔ میروں نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ خوش نہ تھا۔ پہلے پہل محبّت اس پر اس طرح مسلّط ہوئی تھی۔ کہ اسے ہر چیز سے بے نیاز بنا دیا تھا۔ اپنی زندگی اس طور پر بسر کرنے کے لئے زائد روپیہ کی ضرورت پڑی تھی۔ اِس کے لئے اس نے باتصویر اخباروں میں قلم برداشتہ چھوٹی موٹی تصاویر بنانی شروع کر دی تھیں۔ جب اپنی قابلیتوں کو یوں

تباہ کرنے پر دل نے ملامت کی۔ تو یہ سوچ کر اپنی تسلی کر لی۔ کہ بہت جلد پھر محنت سے کام شروع کر دوں گا۔ لیکن جُوں جُوں وقت گذرا۔ وہ اخلاقی طور پر کمزور ہوتا چلا گیا۔ تقریباً بُزدل بن گیا۔ اور اب ایک تلخ احساس نے اس کے دل کی گہرائیوں میں کچلیاں گاڑ رکھی تھیں۔ اسے اپنے اوپر شرم سی آتی تھی۔ اُس بے روح محبت پر شرم آتی تھی۔ جس پر رفتہ رفتہ مگر یقینی طور پر اُس نے اپنے تمام اوصاف بھینٹ چڑھا ڈالے تھے۔ قرض بڑھتا گیا۔ اور آخر کار ایک روز ایسا آیا۔ کہ قرض خواہوں کی دھمکیوں اور محبوبہ کے جھگڑوں قضیوں سے عاجز آ کر اس کا سر پھر گیا۔ اور اس نے ایک ایسا چیک لکھ ڈالا جس کا روپیہ ادا کرنے کی توفیق نہ رکھتا تھا۔ امید تھی۔ کہ چیک بنک میں پیش ہونے سے پہلے روپیہ پیدا کر لوں گا۔ پر نہ کر سکا۔ اور آخر ڈر کے مارے پیرس اور فرانس سے بھاگ نکلا۔

اس خیال سے کہ کوئی کچھ شبہ نہ کرے۔ وہ اکیلا ہی رخصت ہوا۔ قرار یہ پایا۔ کہ محبوبہ اگلے روز روانہ ہوئی۔ اسے اتنا پختہ یقین تھا۔ کہ اگلے روز وہ میرے پیچھے پیچھے آ جائے گی۔ کہ رات کے وقت بغیر کسی قسم کے انفعال کے بستر پر لیٹا اور ہنسی خوشی پڑ کر سو رہا۔ امید تھی کہ صبح تک اس کا کوئی خط ملے گا جس سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ کس وقت آ رہی ہے اس کے بدلے اگلی رات ایک تار ملا۔ جس میں بس صرف یہ چار لفظ لکھے تھے "میں نہیں آ رہی"۔

پہلے پہل تو کچھ ایسا بھوچکا سا رہ گیا۔ کہ اس کا مطلب ہی نہ سمجھ سکا۔ کسی طرح ممکن نہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ پیغام اس کا ہو۔ پر کچھ دیر کے بعد بغیر کسی قسم کی تلخی کے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ آخر سچ تو کہتی ہے۔ تو پور۔ تجھ سے اسے کیا واسطہ؟ مٹی ہوئی محبت کے خیالات ان دنوں کی یاد میں ڈوب گئے۔ جب اس کی آنکھیں شہرت کے انتظار

میں کھلی رہتی تھیں۔ ایک عظیم ذہنی اور طبعی تھکن نے اس قسم کی کیفیت پیدا کر دی۔ جیسے وہ ایک بچہ ہے اور راہ سے بھٹک کر کھو یا گیا ہے۔ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے کے لئے عزم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں ذرا سا عزم بھی باقی نہ بچا تھا۔ ٹھان لی۔ کہ واپس پیرس چلو۔ گرفتار ہو جاؤ۔ اور سزا بھگتو۔ جانتے بوجھتے ہوئے اپنے فن کو ذلیل کرنے سے جو کوفت اٹھائی تھی۔ اس سے بڑھ کر اب اور کوئی شے تکلیف دہ نہ ہو سکتی تھی۔ سزا ہو گئی۔ تو دنیا بھر کی نظروں کے سامنے ذلیل ہونا تو نہایت صحیح اور مناسب انجام معلوم ہوگا۔ پر عدالت اور قید ایسی ذلتیں تھیں۔ جن سے بچے رہنا ابھی اپنے ہی اختیار کی بات تھی۔ چنانچہ ان کا خیال آتے ہی دل میں پہلے تو کچھ تامل پیدا ہوا۔ مگر پھر سوچا۔ آخر ان سے گھبرانے کی وجہ؟ انسان اپنے بچاؤ کی کوشش تو اس وقت کرتا ہے۔ جب اسے اپنی بیوی کی نگہ

ہو۔ یا والدین۔ دوستوں اور ایسی ہستیوں کا خیال دامنگیر ہو۔ جن سے احترام کے جذبات وابستہ ہوں۔۔۔ لیکن تم تو؟

اس نے ایک اخبار اُٹھا لیا۔ اور اُکھڑے اُکھڑے جی سے اُس کا مطالعہ کرنے لگا۔ یکبخت اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ جلی قلم میں ایک عنوان لکھا تھا (میروں مصور غائب ہو گیا) اچھا خاصا طویل مضمون تھا۔ اسے پڑھتا رہا۔ بار بار پڑھتا رہا۔ پڑھتے پڑھتے ایک نیا خیال دل میں آیا۔ کہ روز کوئی نہ کوئی خائن خزانچی مفقود الخبر ہوتا رہتا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا۔ کہ کوئی جعل ساز گرفتار نہ ہوتا ہو۔ پر کبھی ان کے معاملات میں بھی لوگوں نے دلچسپی لی؟ یہ مضمون واضح طور پر بتا رہا تھا۔ کہ اس کے فرار میں لوگوں نے غیر معمولی توجہ سے کام لیا ہے۔ اس کے یوں کھوئے جانے پر لوگ مغموم ہیں۔ اگر اخبار میں اتنی بہت جگہ اس کے لئے وقف کی جا سکتی ہے

تو اس سے ظاہر ہے۔کہ لوگوں نے اب اس کے کمالات کا اعتراف اور ان کی قدر کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ گمنام شخص نہیں۔کچھ حیثیت رکھتا ہے۔ نامور آدمی ہے؎
رسوائی نے اس کے کمالات کا انکشاف کر دیا تھا۔قید کا خیال جو بڑی معمولی بات معلوم ہوتا تھا اب بھیانک نظر آنے لگا۔شرم۔خوف اور خودداری کے احساس نے اسے ایک کرب میں مبتلا کر دیا۔ دنوں تک ایک کمرے میں بند ہو کر بیٹھا رہا۔کوئی شخص اس کی کھڑکی کے نیچے کھڑا بھی ہو جاتا۔تو اسے شبہ کی نظروں سے دیکھتا۔اس کے مفقود الخبر ہو جانے پر اور اس سے بھی زیادہ اس کے فن پر اخبارات جو کچھ لکھ رہے تھے۔انہیں بے حد ذوق وشوق سے پڑھتا۔تھوڑے ہی عرصے میں اس کا تذکرہ اخبارات کے صفحہ اوّل سے خارج ہو کر دوسرے صفحے میں اور پھر تیسرے صفحے میں پہنچ گیا۔پھر متواتر

دو روز تک اس کے متعلق کچھ نہ چھپا۔ دو تین مرتبہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ذرا ذرا سا تذکرہ اور ہوا۔ اور پھر خاموشی۔ لوگوں نے اس کی یاد اور حکام نے اس کی تلاش ترک کر دی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ میں بچ نکلا ہوں۔ جہاں چاہوں آ جا سکتا ہوں۔ بالکل آزاد ہوں۔

اب اس وقت اسے احساس ہوا۔ کہ میں دنیا میں بے تعلق اور یکسا تن تنہا ہوں۔

پھر ضرورتوں نے ستانا شروع کر دیا۔ پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ محنت مزدوری سے روزی کمانے کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔ لیکن کرے کیا؟ تصویریں بنائے؟ رنگ آمیزیوں کے جوہر دکھائے؟ اور اس طرح لوگوں کو موقع دے۔ کہ اس کا انداز خاص پہچان کر اسے گرفتار کریں؟

وہ بھلا اس خطرے میں کیونکر از سر نو پڑ سکتا تھا۔ کہ جس ناموری پر اب نازاں تھا۔ پرانی یادیں تازہ

کر کے اس پر پانی پھیر دے؟ آج جب کہ وہ اپنی تصاویر کسی کو نہ دکھا سکتا تھا۔ پہلی مرتبہ اسے اپنے حقیقی کمال سے پوری آگاہی حاصل ہوئی تھی۔ لیکن گذر اوقات کے لئے روپیہ کمانے کو اب کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ سوچا۔ طالب علموں کو سبق دینا شروع کر دوں۔ پر کسی نے اُس کی طرف توجہ نہ کی۔ چاہا کسی دفتر میں کام مل جائے۔ پر ضروری اسناد پاس نہ تھیں۔ ہار کر طرح طرح کے کام کئے۔ وہ ادنےٰ کام بھی۔ جن کے سرانجام دینے میں جسمانی قوت کے سوا اَور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کپڑے میلے چکٹ ہو گئے۔ جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔ وجاہت غائب ہو گئی۔ اور ڈاڑھی کے بال سفید پڑ گئے۔ بار ہا ارادہ کرتا۔ کہ جان دے ڈالے۔ لیکن آخری وقت میں ہمت جواب دے جاتی۔ خیال اُڑتا ہوا گئے گذرے دنوں میں پہنچ جاتا۔ اپنا وہ ننھا سا تصویر خانہ یاد آجاتا۔ جہاں بڑے بڑے عظیم الشان خواب

دیکھا کرتا تھا۔ امید کا ایک مبہم سا احساس خیالات کی ساری رَو کو بدل ڈالتا۔

جُوں جُوں برس گذرتے گئے۔ اپنا پُرانے زمانے کا یہ تصور زیادہ رنگین ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اِس ارمان نے دل پر تسلط پالیا۔ کہ یا تو پھر وہی پُرانی شخصیت اختیار کرے۔ یا اسی داغ بیل پر اپنے لئے ایک نئی شخصیت تیار کرے۔

طویل اور ویران اور بے رنگ مہینوں میں جب وُہ تھوڑا سا روپیہ بچا لینے کو انتہائی محنت کر رہا تھا۔ یہی ارمان اُس کی اُمیدوں کا سہارا بنا ہُوا تھا۔ کھانے پینے میں کفایت برتتا۔ بعض اوقات رات کو کھلے آسمان ہی کے نیچے پڑ کر سو رہتا۔ یوں ہی پیسہ پیسہ کر کے آخرکار تھوڑی بہت پونجی اس کے پاس جمع ہوگئی۔ جوانی کا خروش پھر عود کر آیا تھا۔

اس نے تصاویر کے خاکے بنانے شروع کر دیئے۔ دیوار پر۔ میز کے کونے پر۔ جہاں کہیں جگہ ملتی بنا

دیتا۔ جس چیز پر نظر ڈالتا۔ تصویر بن کر نظر آتی۔ اسی طرح جب سو فرنیک جمع کر لئے۔ تو ریل میں سوار ہو کر۔ فرانس واپس آ گیا+ پیرس چھوڑے پندرہ برس ہونے آئے تھے۔ اب بھلا کس کو یاد آ سکتا تھا۔ سفید بال لمبی ڈاڑھی اور جھکے ہوئے شانوں کے ہوتے کون اسے پہچان سکتا تھا؟

پہلے پہل باہر نکلنے کی جُرأت نہ پڑتی تھی لیکن جب اطمینان ہو گیا۔ تو بے اختیار ہو کر تصویریں بیچنے والوں کی دُکان کی طرف چلا۔ جہاں تصاویر نمائش کی غرض سے الماریوں میں رکھی رہتی تھیں+ وہاں دیکھا کہ نئے نئے لوگوں کے کام موجود ہیں۔ ایسے لوگوں کے جن کے نام سے وہ آشنا نہیں+ گئے گذرے دنوں میں اس نے کبھی کسی سے اپنے کمالات کا ذکر نہ کیا تھا۔ پر آج آپ سے آپ اپنے کام کا مقابلہ ان تصویروں سے کرنے لگا۔ دل ہی دل میں بولا "میں اس سے بہتر کام کر سکتا ہوں!"

تصویر بنانے کا کپڑا کچھ رنگ اور چند برش خرید لایا۔ اور اپنے ننھے سے کمرے میں کام شروع کر دیا۔ ایک مجنونانہ جوش سے رنگ آمیزیاں کرتا رہا۔ کبھی کبھار یوں رُک جاتا۔ جیسے لمبی بیماری بھگتنے کے بعد مریض حرکت کرنے سے ٹھٹکتا ہے۔ تصویر بنا چکا۔ تو سارے دن بیٹھا اُسے تکتا رہا۔ بار بار اپنے سے پُوچھتا:۔

"اچھی ہے؟ بری ہے؟"

معلوم ہوتا تھا۔ اب اپنے کام پر تنقید کرنے کی قابلیت نہیں رہی۔ آخر کار دل کڑا کیا۔ جو نام سب سے پہلے ذہن میں آیا۔ اُسے مصوّر کی حیثیت سے تصویر پر لکھ دیا۔ نور تو۔ پھر تصویر کو بغل میں دبایا۔ اور ایک تصویر بیچنے والے کی دُکان کو چل کھڑا ہوا۔ وہاں پہنچا۔ تو جوش قلب سے بات کرنی دشوار ہو رہی تھی۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا:۔

"میں مصوّر ہوں . . . میرے پاس روپیہ نہیں

۔ ۔ ۔ نہ جانے آپ تصویر خرید لیں گے یا نہیں ۔ ۔ ۔"

"کس کی بنائی ہوئی؟"

"کس کی ۔ میری!"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"لوریلو"۔

"افسوس ہے ۔ ان دنوں تو ہم تصویریں خرید نہیں رہے"۔

رنگ پیلا پڑ گیا ۔ حلق خشک ہو گیا ۔ تصویر بغل سے نکال لی۔

"ایک بار دیکھ تو لیجئے"۔

دکان دار نے تصویر پر نظر ڈالی ۔ آگے بڑھا ۔ اپنے ہاتھ میں لے لی ۔ پھر اپنے حصے دار کو پکارا۔

"دیکھنا یہ تصویر؟ کیوں کیسی ہے؟"

"بری تو نہیں"۔

دوسرے نے کہا ۔ "گویا نہایت اچھی ہے؟"

"یہ کیا اس بوڑھے شخص نے بنائی ہے؟"

"ہاں۔"

دونوں اکٹھے الماری کے قریب کھڑے تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میروں نے سنا ایک کہ رہا ہے:۔

"حیرت انگیز ہے . . . کمال ہے! بھلا بتاؤ تو اسے دیکھ کر مجھے کیا یاد آیا؟ وہ بدمعاش میروں اس قسم کا کام کیا کرتا تھا۔ ویسے یہ اس سے دس گنا بہتر کام ہے۔"

میروں دروازے کے قریب ایک کونے میں بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ یہ بات سنی تو چونک اُٹھا۔

پوچھنے لگا "آپ نے کیا فرمایا؟"

دکان دار مسکرا پڑا "تمہارا ذکر نہیں۔ میں اپنے حصے دار کو بتا رہا تھا۔ کہ تمہارا کام دیکھ کر ایک دوسرے مصور کا خیال آجاتا ہے۔ جس کا نام میروں تھا"۔

میروں نے سوچتے ہوئے دہرایا:۔

ہیروں . . . ہیروں . . . "

"میرے ہاں اُس کی ایک تصویر ہے۔ تم جانتے ہو اُسے؟"

ہیروں نے آہستہ سے کہا۔ "جی ہاں!"

"تمہارا انداز اور تمہارے کام کی خصوصیات اسی کی ہیں۔ لیکن کام اُس سے بہتر ہے۔ دکان دار ہوتے ہوئے مجھے تم سے یہ کہنا تو نہ چاہیے تھا"۔

دکان داروں نے اسے دکھانے کو الماری میں سے جو تصویر نکالی تھی۔ ہیروں کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ لڑکھڑاتی زبان سے کہنے لگا۔ "نہیں تو . . . میرا کام اس سے بہتر نہیں"۔

"قطعی ہے۔ میرول محض خدا داد ذوق سے تصاویر بناتا تھا۔ تم مکمل ماہر فن ہو۔ اور میری رائے کا ثبوت یہ ہے۔ کہ میں نہ صرف تمہاری یہ تصویر لینے پر آمادہ ہوں۔ بلکہ جتنی تصویریں تم بناؤ گے۔ میں ان سب کا خریدار بننا چاہتا ہوں۔ میں سب کی سب

بیچ دوں گا۔ دو مہینے میں تمہارے کام کا چرچا ہو جائے گا۔ دو سال میں تم مشہور ہو جاؤ گے۔ اور میرا دعویٰ ہے کہ پیروں کو سب لوگ بہت جلد بھلا ڈالیں گے۔

پیروں سنتا رہا۔ اور اس کا رنگ پیلا پڑتا گیا۔ اتنی داد و تحسین کے الفاظ جو کسی زمانے میں اُسے بے انتہا مسرور کرتے۔ آج دکھ پہنچا رہے تھے۔ یک لخت اسے احساس ہوا۔ کہ اُس میں قدر کے قابل اور احترام کے لائق اگر کوئی شے تھی۔ تو صرف وُہ شخصیت جو وہ اب کبھی اختیار نہ کر سکتا تھا۔ وُہ پیروں جس کی فنا کا فتوےٰ اس نے ابھی ابھی سُن لیا تھا۔ لوریو کی کامیابی اور ناکامی سے تمہیں کیا؟ تم لوریو نہیں ہو۔ لوریو ایک اجنبی ہے۔ جسے صرف اس لئے دعوت دی گئی ہے۔ کہ سامنے آ کر تمہاری حقیقی شخصیت کا کامیاب رقیب بن جائے۔ ایک بے نام و نشان ہستی۔ جو تمہارے نام کو اور فنون لطیفہ کی دنیا میں اس کی ہر اہمیت کو فنا کر ڈالے گی۔

دکان دار باتیں کرتا رہا۔ مگر اس نے کچھ توجہ نہ کی اس کی کوئی بات نہ سنی۔ خیال ہی خیال میں دیکھا۔ کہ ایک خریدار دکان میں آیا ہے۔ اور ہیروں کی بنائی ہوئی تصویر مانگ رہا ہے۔ اور یہ دکان دار اپنے گھناؤنے تبسم سے کام لے کر اسے نوریو کی تصویر دکھاتا ہے۔ اور کہتا ہے :

ہیروں؟ . . . آپ اس کی تصویروں سے بہت بہتر تصویریں کیوں نہیں؟ یہ تصویر ملاحظہ فرمائیے"

اس خیال کی تاب نہ لا سکا۔ اپنی مردہ شخصیت پر دل ہی دل میں یوں ماتم کرنے لگا۔ جیسے کوئی شخص آخری محبت کی یاد پر نوحہ خواں ہوتا ہے۔

دکان دار کہہ رہا تھا" تو پھر معاملے کی بات ہو جانی چاہئے۔ قیمت کیا لو گے ؟"

ہیروں نے اپنی ملول نظریں اٹھائیں۔ پر کچھ جواب نہ دیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ ذہن اس سوال کا مطلب اخذ نہیں کر سکا۔

"یعنی تم یہ تو قطعی سمجھتے ہو گے۔ کہ میں پہلی ہی تصویر کا زیادہ معاوضہ ادا نہیں کر سکتا۔ نوریو اور میروں کے کام کا فرق سمجھتے سمجھتے بھی لوگوں کو کچھ عرصہ لگ جائے گا۔ پھر کئی خریدار رہنمائی بھی چاہتے ہیں۔ وہ علیحدہ بات ہے۔ کہ انجام کار میروں کی تصویریں طاق نسیاں کے حوالے ہو جائیں گی"۔

مصوّر اب تک گم سُم کھڑا تھا۔ دکان دار کا خیال تھا۔ کہ قیمت پر غور کر رہا ہے۔

"اچھا اگر میں اس کی . . ."

میروں نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا:

"کچھ عرصہ کو معاملہ ملتوی کرنا چاہتا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا . . ."

"اچھی بات۔ پر تصویر چھوڑتے جاتے۔ میں میروں کی تصویر کی جگہ اسے الماری میں رکھے دیتا ہوں"۔

میروں نے کہا: "نہیں"۔

"بڑی غلطی کر رہے ہو۔ اس قسم کا نادر موقع ہاتھ آجائے تو انسان کو تامل نہیں کرنا چاہئے۔ مَیں جو قدر تمہاری کر رہا ہوں۔ اگر کہیں اس بدمعاش ہیروں کی کرتا۔ تو غالبًا وہ اب تک یہیں ہوتا۔ اور جو حرکت اُس نے کی ہے۔ کبھی نہ کرتا۔"

ہیروں نے منہ ہی منہ میں کہا۔ "سچ ہے۔" وہ کانپ رہا تھا۔

"یقینًا تم میری شرائط کو رد نہ کرو گے۔ انجان تھوڑا ہی ہو۔"

"مَیں انہیں رد کرتا ہوں۔ تصویر مجھے دیجئے۔"

"لیکن میں . . ."

ہیروں نے پھر کہا۔ "تصویر مجھے دیجئے۔" آواز گلوگیر تھی۔ اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک انوکھی چمک نظر آرہی تھی۔

دکان دار بولا۔ "بڑے افسوس کی بات ہے! پھر کہتا ہوں۔ مجھ سے معاملہ کرتے۔ تو مَیں تمہیں ہیروں

سے بھی زیادہ نامور بنا دیتا۔"

ہیرو نے دوبارہ کہا "سچ ہے"۔ اور دکان سے رخصت ہو گیا۔

اندھیرا پھیل چلا تھا۔ کئی لوگ جو جلدی جلدی آجا رہے تھے۔ اس سے ٹکرا ٹکرا گئے۔ نمناک اور ویران سی شام تھی۔ اسی رات سے ملتی جلتی جب وہ فرار ہو گیا تھا۔ وہ تصویر ہاتھ میں لئے سڑک پر کھڑا تھا ہاتھ پھیلا کر، پھر تصویر کو تھامے رکھا۔ پھر ایک گذرتی ہوئی گاڑی کے آگے پھینک دیا۔ ایک شخص نے کہا "تمہاری کوئی چیز گر پڑی ہے"۔ ہیرو نے جواب دیا "معلوم ہے . . . یوں ہی تھی . . . آپ کی مہربانی"۔

اسی وقت گھوڑے کا سُم چوکھٹے پر پڑا . . . اور پھر پہیا گذر گیا۔ تصویر پر سے گاڑی گذری۔ تو بڑی خفیف سی آواز پیدا ہوئی۔ پر اتنے ہی میں کپڑا پھٹ چکا تھا۔ اور کیچڑ میں یوں لت پت تھا۔ کہ

معلوم ہوتا تھا۔ بس ایک مڑا تڑا خالی کاغذ پڑا ہوا ہے
میروں پھر دکان کی نمائشی الماریوں کے
سامنے آیا۔ وہاں اُس کی تصویر ایک اعزازی مقام پہ
آویزاں تھی۔ کہر سے روشنی مدھم ہو رہی تھی۔ تاہم
روشن دُھند میں سے اُسے چوکھٹے پر لگی ہوئی وہ
چِٹ نظر آ رہی تھی۔ جس پر اس کا نام میروں لکھا تھا
وہ دیر تک کھڑا ایسی نظروں سے اُسے تکتا رہا۔ جن
میں لوچ جھانک رہا تھا۔ اور گئے گذرے دنوں
کی باتیں اُسے یاد آتی رہیں۔ وہ رخصت ہونے کے
لئے مڑا۔ تو ایک آنسو اُس کے رخساروں پر بہ رہا
تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار میں جس سے سڑک کے کنارے
کی گذرگاہ دمک رہی تھی۔ وہ وہاں سے رخصت ہو
گیا۔

آسودگی

قیدی عورت نے فردِ جرم کو کامل سکون و سکوت کے ساتھ سُنا۔ اور منصف نے جو سوالات کئے۔ ان کا جواب مُبہم فقروں میں دیتی رہی:

"جب میرا بچہ پیدا ہُوا۔ تو میں اکیلی تھی، چاہا کہ اٹھ کھڑی ہوں۔ امداد کے لئے کسی کو پکاروں۔ پر سکت نہ تھی، بچے کو بستر پر اپنے پہلو میں ڈال لیا۔ . . اس کے بعد میں ضرور بے ہوش ہوگئی ہوں گی۔ اگلے روز صبح سویرے ہوش میں آئی تو دیکھا۔ کہ بچے کا پنڈا برف ہے . . . کون جانے

میں اس کے اوپر پڑی رہی۔ اور اس سے اُس کا دم گھُٹ گیا ۔ ۔ ۔ کیا خبر جب میں نے اُسے پہلو میں لٹایا۔ اُسی وقت مرچکا ہو ۔ ۔ ۔ بیہوش ہونے سے پہلے کیا ہُوا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا ہے۔ پھر یہ بات کیونکر معلوم ہو سکتی ہے؟ ۔ ۔ ۔"

"بچّہ رویا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں؟"

"اور اس کی کیا وجہ کہ اپنی خادمہ کے روبرو تمہارا رویہ ایسا رہا۔ جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں؟ گواہوں سے پُوچھو۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ جب تم نے بچّے کی ننّھی نعش کو دیکھا۔ تو تم ذرا بھی مضطرب نہ ہوئیں۔ چلو ذرا سی دیر کو ہم یہی فرض کئے لیتے ہیں۔ کہ جو کچھ ہُوا اتفاقی حادثے سے ہُوا۔ پر یہ بات بھی تو قابلِ غور ہے۔ کہ بچّے کے پیدا ہونے سے پیشتر اُس کا باپ گذر چکا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد اُس کا بچّہ تمہیں اور بھی زیادہ عزیز ہونا چاہیئے تھا۔ چونکہ میں پہلے ایک گواہ

کی شہادت کا حوالہ دے چکا ہوں۔ اس لئے دوسروں کی شہادت کو خاموشی سے نہ نظرانداز کر سکتا ہوں نہ کروں گا۔ تو ایک دوسرے گواہ کی شہادت سے ظاہر ہے۔ کہ تمہاری شادی تمہاری اپنی رضامندی اور باہمی محبت کا نتیجہ تھی۔ اور شادی کے بعد تم میاں بیوی نے پوری پوری خوشی کی زندگی بسر کی۔ اگر ہم اخلاق کے تقاضا سے قطع نظر بھی کر لیں۔ اور محض مادی ثبوتوں پر غور کریں تو اس بات کا کیا جواب کہ ڈاکٹر کی رائے میں بچے کی گردن پر اس قسم کے نشان ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ گلا گھونٹ کر اس کا کام تمام کیا گیا ہے؟ جا بجا ناخن کی ایسی کھرنچیں موجود ہیں۔ جو ناخنوں ہی سے پڑ سکتی تھیں۔ مزید برآں بچے کی حالت دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ غالباً زندہ رہتا۔ بلکہ یہ کہ وہ کچھ عرصہ زندہ رہا بھی۔ بچہ گئیں۔ وہ اچھے خاصے عرصہ زندہ رہا۔۔۔"

عورت کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر اور سسکیاں بھر بھر کے رونے لگی۔ دل کی بھڑاس نکال چکی۔ تو جج نے پھر تقریر شروع کی!

"اب ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ ان الزاموں کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟"

ایک ادائے اضمحلال سے عورت نے بیوگی کا لمبا نقاب اپنے چہرے پر سے اٹھا دیا۔ آنسوؤں کی وجہ سے چہرہ سُوجا سُوجا معلوم ہو رہا تھا۔ آنکھیں لال لال تھیں۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ دیکھتے ہی حاضرین کا دل رحم سے دُکھ کر رہ گیا۔ عدالت پر مکمل اور توقیر آمیز سکوت چھا گیا۔

بولی۔ "مجھے بخش دیجئے۔ کہ اب تک آپ کے سوالوں کا جواب کچھ کا کچھ دیتی رہی ہوں۔ اب اور جھُوٹ نہیں بولا جاتا۔ جو دُکھ اندر ہی اندر سہہ رہی ہوں۔ بڑا سخت ہے۔ سچ بول دوں تو شاید کچھ تسکین ہو جائے۔ میں مانتی ہوں۔ خود میں نے اپنے

نے بچے کو ہلاک کر ڈالا ہے"۔

جج نے کچھ اشارہ کیا۔ عورت نے اپنے ہاتھ یوں پھیلا دیئے۔ گویا جو الزام وہ لگانا چاہتا ہے۔ اُس سے اُسے روکنا چاہتی ہے:

"پر مَیں نے پہلے سے اِس جُرم کا ارادہ نہ کر رکھا تھا۔ جیسی قسم جی چاہے لے لو۔ میرا ارادہ یہ نہ تھا۔ جتنی جلدی بیان کر سکتی ہوں۔ مَیں تمام بات پورے پورے طور پر بیان کئے دیتی ہوں۔ کہ پھر کبھی کسی کی زبان پر اس تذکرہ کو نہ سُنوں ...

"مَیں امید سے تھی۔ کہ ان ہی دنوں میرا شوہر بیمار پڑ گیا۔ اُس وقت تک اُس کی صحت بڑی اچھی رہی تھی۔ پہلے پہل تو مَیں یہ سمجھی۔ یوں ہی کسی وجہ سے طبیعت ناساز ہو گئی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ اُدھر خود میرے شوہر نے بھی ایسا ظاہر کرنا شروع کیا۔ جیسے تندرست ہو گیا ہے۔ پر انجام کار مجھے تشویش ہونی شروع ہوئی۔ وہ اس لئے کہ اگرچہ اُسے

کوئی خاص دکھ درد تو نہ تھا۔ پر وہ ہر وقت فکر مند اور کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ ہمیشہ سے دیکھتی آئی تھی۔ کہ طبیعت کا سلیم اور بڑا خوش مزاج ہے۔ لیکن اس موقع پر میں نے اُس سے منت سے پوچھا "مجھے بتاؤ تو آخر شکایت کیا ہے؟" تو سراسیمہ ہو کر۔ بلکہ اچھا خاصا بگڑ کر بولا۔

"کچھ نہیں۔ . . ہوتا کیا۔ . . کیوں پریشان کرتی ہو۔ . . یوں ہی ذرا طبیعت بگڑ گئی ہے۔ کوئی ایسی خاص بات نہیں . . . چند روز میں ٹھیک ہو جاؤں گا . . ."

"میں نے کہا "کسی ڈاکٹر سے مل لیتے" یہ سُن کر اس کے غصّے کا کچھ ٹھکانا نہ رہا۔

"اب میں نے اس کا رنگ ڈھنگ اور اپنے سے سلوک یوں بگڑا ہُوا دیکھا۔ تو جی ہی جی میں گھبرانے لگی۔ کہ الٰہی میں نے اپنے شوہر کے متعلق جو اعلےٰ رائے دل میں قائم کر رکھی ہے۔ وہ سراسر غلط

ہے؟ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے چال چلن کو جیسا میں سمجھتی رہی ہوں۔ یہ اُس سے بالکل مختلف ہو؟

"اس کے بعد ایک روز رات کا ذکر ہے۔

ہم کھانا کھا کر اٹھنے ہی کو تھے۔ کہ میرے شوہر نے کہا، سر میں شدت کا درد ہے۔ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں۔ وہ اپنی جگہ پر سے اچھل پڑا کرسی الٹ گئی۔ اور شان نہ گمان زمین پر گر پڑا۔ ساتھ ہی میز کی طشتریاں اور گلاس چادر کے ساتھ گھسٹ کر زمین پر آ رہے۔ میرے شوہر نے زمین پر گرتے ہی تڑپنا شروع کر دیا۔ عجیب عجیب آوازیں نکال رہا تھا۔ جن کا مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ نوکر ڈر کے مارے سکتے کے عالم میں تھے۔ میں دوڑ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور بات کرنی چاہی۔ پر میری کوئی بات سننا تو در کنار وہ مجھے پہچان بھی نہ سکا۔

"ڈاکٹر آیا۔ جو سب سے قریب رہتا تھا۔

اسے بلالائے تھے۔ اس نے سرسری سا معائنہ کیا۔
اب میں بھی جانتی ہوں۔ اس مرض کو سمجھنے کے لئے
زیادہ دیر معائنہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پوچھا اس
نسیم کا دورہ کبھی پہلے بھی پڑا ہے؟
"میں نے کہا، پہلا ہی ہے۔ کس مرض کا دورہ
ہو سکتا ہے؟'
" اس نے اچنبھے سے مجھ کو دیکھا۔ میرے اس
سوال پر بڑا حیران ہوا تھا۔ سر ہلایا اور ہلکے سے بولا۔
'جلد یا بدیر تمہیں معلوم تو ہو ہی جانا ہے۔ یہ مرگی کا دورہ
ہے'۔"
"خداوندا تیری پناہ! کیسا بھیانک لفظ تھا۔
آج تک میرے کانوں میں اس کی گونج باقی ہے۔
مجھے یاد تھا کہ میں نے اس لفظ کو اس وقت تک
جب کبھی سنا۔ میرے دل میں ہیبت اور نفرت پیدا
ہوگئی۔ ایک مرتبہ اپنے ابا جان کے ساتھ بازار میں
سے گذر رہی تھی۔ تو دیکھا کہ ایک جگہ کچھ مجمع ہے۔

ہم رُک گئے۔ کہ معلوم کریں۔ کیا بات ہوئی ہے۔ لیکن میرے ابا جان نے جلدی سے مجھے وہاں سے ہٹایا اور کہا "نہ دیکھو۔۔۔ کوئی مرگی کا مارا ہے۔۔۔"

"اور آج خود میرا شوہر۔ اس مرض کا شکار نظر آرہا تھا۔۔۔ میں تصویر بنی کھڑی تھی۔ جرأت نہ پڑتی تھی۔ کہ اس نصیبوں جلے کے قریب بھی جاؤں۔ جسے سب نے زور لگا کر زمین کے ساتھ جکڑ رکھا تھا"

ڈاکٹر کو اپنی وحشیانہ صاف گوئی پر کچھ تاسف ہوا۔ بولا "مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ لیکن اب محض اس بیماری کا نام سُن کر اسے بہت زیادہ ہیبت ناک نہ سمجھ بیٹھئے۔ یعنی اس امر سے تو انکار کرنا بے سود ہے۔ کہ بڑا اندیشہ ناک مرض ہے۔ لیکن عام طور پر جتنی سمجھی جاتی ہے۔ اس سے بہت زیادہ عام بیماری ہے۔ اور جن لوگوں کی مناسب تیمارداری ہو سکے۔ ان کے لئے اس میں کچھ زیادہ خطرہ نہیں۔ آپ کے شوہر پر سے اس کا یہ دورہ جلد

گذر جائے گا۔ اور پھر غالباً مہینوں شاید برسوں اس قسم کی تکلیف نہ ہو۔ میں اس میں کچھ کر نہیں سکتا۔ صرف اتنی تنبیہہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اب کچھ عرصے تک آپ اس بات کی احتیاط کیجئے۔ کہ آپ کے ہاں بال بچّہ نہ پیدا ہونے پائے۔''

''میں دو مہینے کے عرصہ سے اُمید سے ہوں . . .''

ڈاکٹر نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا لئے۔ ایک خواب آور دوا کا نسخہ لکھا۔ اور رخصت ہو گیا۔

رات میں میرا شوہر ہوش میں آگیا۔ جب مجھے اپنی پٹی سے لگا ہوا بیٹھا دیکھا تھا۔ تو اُسے اتنی جرأت نہ پڑی۔ کہ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دے۔ مجھے بھی حوصلہ نہ ہُوا۔ کہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں . . . مجھے تب سے آپ یقین ہو گیا تھا۔ کہ اسے شروع سے اپنے مرض کا سب حال معلوم تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اسے مجھ سے چھپایا۔

میری تیمارداری سے احتراز۔ فکر و تردد کا استغراق ۔ آشفتہ مزاجی - یہ سب کیوں تھا؟ صرف اس ڈر کے مارے کہ اُسے یقین تھا ۔ آخر میں اصل بات مجھے معلوم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ مَیں نے اپنے والدین سے کچھ نہ کہا۔ بس دو خطروں کے درمیان اُدھر میں لٹکتی تھی۔ یا تو اپنے شوہر کے ساتھ تن تنہا رہ جاؤں یا اس مرض کی کیفیت کو اَوروں سے بھی بیان کر دوں ۔ لیکن مجھے اس خواہش نے بیتاب کر رکھا تھا کہ پہلے اصل بات یقینی طور پر معلوم ہونی چاہیے ۔ معلوم کرنا کچھ دشوار بھی نہ تھا ۔ لوگوں کو اس سے زیادہ خوشی اور کس بات میں ہو سکتی ہے ۔ کہ دوسروں کی مصیبتیں اور کم نصیبیاں بہ تفصیل کسی کو سنائیں ۔ تھوڑے ہی دنوں میں مجھے اپنے شوہر کے خاندان کے تمام واقعات معلوم ہو گئے ۔

" اس کے والد کا انتقال مرگی سے ہوا تھا ۔

" اس کا ایک بھائی جس کے متعلق یہ مشہور تھا

کہ کہیں پردیس میں چلا گیا ہے۔ اور اب کچھ معلوم نہیں۔ کہ کہاں ہے۔ پاگل خانہ میں موجود ہے۔

"ایک دوسرا بھائی جو پیدائشی سودائی تھا۔ بیس سال کی عمر میں مر گیا۔

"میرے شوہر کو چودہ سال کی عمر سے مرگی کے دورے پڑ رہے ہیں۔

"یہ تھے اس خاندان میں وراثت کے ہیبت انگیز واقعات جو میری آنکھوں کے سامنے دہک رہے تھے۔ اس خاندان میں سے ہر ایک اسی لعنت کا شکار تھا۔ میں نے جی ہی جی میں سوچنا شروع کیا۔ کہ جو بچہ میں اپنے پیٹ میں اُٹھائے پھر رہی ہوں۔ کہیں وہ بھی اسی لعنت سے آلودہ نہ نکلے۔

"اب میں اپنے جرم کا اقرار کر رہی ہوں۔ تو سب کچھ صاف صاف من وعن بیان کر دوں گی۔ آپ کا جی چاہے تو مجھے مجرم ماں قرار دینے سے پیشتر شوق سے بدکار بیوی اور ناخلف دختر بھی کہہ

لیجے۔ اس سے کیا ہو جائے گا۔ میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتی ہوں۔ کہ اس وقت سے میری زندگی دوزخ کا نمونہ بن گئی۔ ہفتوں تک کوئی رات ایسی نہ گذری۔ کہ بھیانک خوابوں نے میری نیند نہ اُڑا ڈالی ہو۔ مجھے اپنے شوہر کے والدین سے بھی نفرت ہو گئی۔ جنہوں نے زبردستی اس خبیث موروثی مرض سے اُسے آلودہ کر دیا تھا۔ اپنے شوہر سے بھی جس نے سنگدل بن کر مجھے فریب دیا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے والدین تک سے نفرت ہو گئی۔ کہ انہوں نے اپنا اہم ترین فرض نظر انداز کر دیا۔ اور ذرا نہ سوچا سمجھا۔ کہ مجھے کس کو سونپے دے رہے ہیں۔

"بہر حال کچھ اس خیال سے کہ میرے دل میں اپنا وقار تھا۔ کچھ اس خیال سے کہ مجھے شرم آتی تھی۔ میں خاموش ہی ہو رہی۔

"چھ ہفتے بعد میرے شوہر کو آخری دَورے

سے بھی سخت ایک دوسرا دَورہ پڑا۔ اس کے بعد دَورے جلد جلد پڑنے لگے۔ بہت جلد یہ حالت ہوگئی۔ کہ پہلے روزانہ اور پھر دن میں دو دو بار دَورے پڑنے لگے۔ کسی چیز سے اُسے افاقہ نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آخر کرب کے دہشت انگیز پیچ و تاب میں اُس نے دم توڑ دیا۔

"اُس کی موت نے میرے دل کے تلخ احساسات کو مٹا ڈالا۔ غم و الم نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ میں نے مرے ہوئے شوہر کی روح کو بخش ڈالا۔ سوچا۔ کہ یہ اُس کی انتہائی محبت ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ اُس نے اصل بات مجھ سے چھپائے رکھی۔

"اس کے بعد کئی بے رنگ مہینے گذرتے چلے گئے۔ میں اپنے خیالوں میں محو اِس انتظار میں وقت گذار رہی تھی۔ کہ کب میرے بچّہ پیدا ہوتا ہے۔ مجھ سے دنوں کے شمار میں ضرور کوئی غلطی

ہو گئی ہو گی۔ کیونکہ بچہ میری اُمید سے دس پندرہ روز پیشتر پیدا ہو گیا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اس وقت میرے ہاں نہ کوئی دائی تھی۔ نہ نرس۔ نہ ڈاکٹر۔ مجھ میں اتنی سکت بھی نہ تھی۔ کہ اٹھ کر گھنٹی بجا دیتی۔ صرف یہ خیال میری ڈھارس بندھا رہا تھا کہ اب میرا ایک بچہ بھی ہو جائے گا۔ اس خیال نے کرب کی حالت میں مجھے خوش کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی جیسے میری آنکھوں پر سے پردے اُٹھ گئے۔ اور تمام خطرے مجھے صاف صاف نظر آنے لگے۔ ابھی میں نے کہا تھا۔ کہ میں نے بچے کے رونے کی آواز نہ سُنی تھی۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں نے اُس کے رونے کی ننھی سی چیخ سُنی تھی۔ یہ ہی آواز تھی۔ جس نے ایک تیر کی طرح میرے دماغ کو چھید ڈالا تھا۔ ڈراؤنے تصور میری آنکھوں کے آگے پھر گئے۔ مجھے اُس کا باپ اور اس کا ہولناک

کرب یاد آگیا۔ مجھے اس کا چچا نظر آنے لگا۔ کہ پاگل خانے کے لباس میں تڑپ رہا ہے۔ پھر دوسرا بھائی وہ گھناؤنا بڑی شخص میرے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر ان سب کے دادا کا۔ اُس جڑ کا جس سے یہ ساری شاخیں نکل کر پھیلی تھیں خیال آیا کہ وہ بھی مرگی کے مرض سے آلودہ تھا۔

"مجھے صاف صاف نظر آنے لگا۔ کہ آخر کار میرا بچہ ایک روز کیا بننے والا ہے۔ میں دونوں باتوں سے سہم گئی۔ جو کچھ آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس سے بھی۔ اور جو کچھ آگے چل کر دیکھنا تھا۔ اس سے بھی۔

"لیکن بعد میں جو کچھ ہوا۔ اُس کے مقابلے میں یہ سب خیال کچھ بھی نہ تھے۔ یک لخت مجھے احساس ہوا۔ کہ زندہ گوشت کا ایک لوتھڑا میرے پہلو میں ہل جل رہا ہے۔ دہشت انگیز جنون مجھ پر طاری ہوگیا۔ چاہا کہ یہ سمجھ کر اپنے آپ کو تسکین

دے لوں۔ یہ میرا بچہ۔ میرا اپنا بچہ ہے۔ مگر میرے
کانوں میں کوئی آواز سرگوشیاں کر رہی تھی:
"جنون کا بچہ! جنون کا بچہ!"
میں یوں لرز اٹھی۔ جیسے کسی گھنا ؤنے
حشرات الارض کو چھو لیا ہے۔۔۔ کسی کو یقین نہ
آئے گا۔۔۔ بھلا تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔۔۔ کوئی
ماں اپنے ہی بچے سے کیونکر خائف ہو سکتی ہے
۔۔۔ ایسی ناتواں ننھی سی شے سے۔ جو ابھی پوری
طرح زندہ بھی نہ ہونے پائی تھی۔۔۔ لیکن واقعہ
یہی تھا۔ اور میں اس احساس پر غالب نہ آسکی۔
میں سمٹ کر اس سے الگ آگئی۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا۔ کہ مجھے اس بڑی ہی ہولناک۔۔۔ غیر
انسانی چیز سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش
کرنی چاہئے۔ میں اس پر جھپٹ پڑی۔۔۔ ننھی
سی گردن کو جو میری انگلیوں میں سے نکلی جاتی تھی
دبوچ لیا۔ ہاتھ بڑھا دئے۔ کہ اگر وہ کوئی کشمکش

بھی کرے۔ تو مجھے چھونے نہ پائے . . . اِس طرح میں نے . . . مجھ دکھ کی ماری کم نصیب نے . . . مجھ ڈائن نے . . . مجھ قاتلہ نے . . . اپنی انگلیوں کو دبانا شروع کر دیا۔"

یہاں تک پہنچ کر عورت رہ گئی۔ گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اور سسکیاں بھر بھر کر کہنے لگی:

"ہائے رے میرے بچے . . . میرے لال . . . میں تجھ سے ڈر گئی تھی . . ."

۱۰-۵۰ کی ایکسپریس

اپاہج نے مجھ سے کہا: "لوگ کہتے ہیں۔ آج آپ ہم لوگوں سے رخصت ہو رہے ہیں؟"

"جانا ضروری ہے۔ مجھے پیر کی صبح کو مارسیلز پہنچنا ہے۔ میں نیوں کے اسٹیشن سے ۱۰-۵۰ کی ایکسپریس میں روانہ ہوں گا۔ اچھی گاڑی ہے . . . پر تمہیں تو اس کا حال معلوم ہونا چاہیئے۔ بیمار پڑنے سے پہلے اسی لائن پر ملازم تھے۔ ہیں نا؟"

اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ چہرہ یک لخت پیلا پڑ گیا۔ بولا "جی . . . معلوم ہے . . . خوب

معلوم ہے ۔ ۔ ۔ ‘‘

اس کی پلکوں کے نیچے آنسو چمک رہے تھے۔

پل بھر چپ رہا۔ پھر بولا: ’’اس کا حال کسی کو ایسی اچھی طرح معلوم نہیں۔ جیسا مجھے معلوم ہے‘‘۔

میں سمجھا۔ اپنے پرانے کام کو جسے اب اپاہج ہونے کی وجہ سے سرانجام نہیں دے سکتا یاد کر کے ملول ہو گیا ہے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

’’وہاں تو کام بڑا دلچسپ ہوتا ہوگا۔ مزے کا کام جس میں بہت سی معلومات کی ضرورت پڑتی ہوگی‘‘۔

وہ کانپ اٹھا۔ مفلوج جسم پر بڑی شدت کا اثر ہوا۔ آنکھوں میں ہیبت جھلکنے لگی۔ احتجاج کے طور پر بولا۔

’’یہ نہ کہئے۔ مزے کا کام؟ یوں کہئے دہشت اور موت کا کام ۔ ۔ ۔ ہیبت اور بھیانک خوابوں کا کام ۔ ۔ ۔ میں آپ کا کوئی نہیں۔ پر آپ سے

ایک عنایت کا امیدوار ہوں + اس گاڑی سے نہ جائیے۔ اور جو ٹرین پسند ہو اس میں سفر کر لیجئے۔ پر ۱۰-۵۰ کی ایکسپریس سے نہ جائیے"۔

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں۔ کچھ وہمی ہو تم؟"

"میں وہمی نہیں ہوں۔ . . لیکن ۲۴ر جولائی ۱۸۹۴ء کو جو حادثہ ہُوا تھا۔ اس روز میں ہی اس ایکسپریس کا ذمّہ دار ڈرائیور تھا۔ میں اس کا حال آپ کو سناتا ہوں۔ پھر آپ سمجھ جائیں گے"۔

". . . ہم لیوں کے اسٹیشن سے حسب معمول روانہ ہوئے اور دو گھنٹے تک سفر کرتے رہے۔ اس روز دن بھر بڑی گھمس رہی تھی۔ ہم بڑی تیز رفتار سے جا رہے تھے۔ لیکن پھر بھی انجن میں جو ہوا آتی تھی۔ اس سے دم گھٹا سا جاتا تھا۔ ایسی بھاری اور گرم ہوا تھی۔ جو طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے . . .

" اچانک سارا آسمان نظر سے یوں اوجھل ہو گیا۔ گویا بجلی کا کوئی بٹن دبانے سے یہ تغیر عمل میں آ گیا ہے۔ ایک بھی تارہ نظر نہ آتا تھا۔ چاند چھپ گیا تھا۔ بجلی بڑے زور سے چمکنے لگی۔ رات کی تاریکی کو چاک کر کے پل بھر کو اس شدت سے چمکتی کہ بعد میں رات کاجل سی کالی نظر آنے لگتی"۔

"میں نے آگ دہکانے والے سے کہا:

"آج تو پھنس گئے۔ موسلا دھار برسے گا"۔

"اچھے وقت پر آیا۔ میرے لئے بھی بھٹی کے سامنے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سگنلوں کا خیال رکھنا ہوگا"۔

"کچھ ڈر نہیں مجھے بہت صاف نظر آ رہا ہے"۔

"کڑک اور گرج اس زور کی تھی۔ کہ نہ مجھے پہیوں کی حرکت کی آواز سنائی دیتی تھی۔ نہ انجن کے چلنے کی۔ بارش ابھی تک شروع نہ ہوئی تھی۔ مگر طوفان قریب تر چلا آ رہا تھا۔ ہم اڑے ہوئے

طوفان کے اندر گھسے چلے جا رہے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا ہم اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔

"لوہے کے جن پر انسان سوار ہو۔ اور وہ کسی جنونی کی طرح ایک بے حد مہیب طوفان میں اڑا چلا جا رہا ہو۔ تو صرف بزدل ہی کا زہرہ آب نہیں ہوتا۔

"ہمارے سامنے ذرا دور بجلی زمین پر گری اور ساتھ ہی ایک بڑی خوفناک گرج سنائی دی۔ پھر ایک اور گرج اس زور کی پیدا ہوئی۔ کہ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور گھٹنوں کے بل گر پڑا۔

"ذرا دیر تک میں اسی حالت میں رہا۔ ڈھیر ہو گیا تھا۔ سُن تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ گردن کی پشت پر بڑی سخت ضرب آئی ہے۔ آخر کار ہوش میں آیا۔ اب تک گھٹنوں کے بل تھا پیٹھ انجن کو جدا کرنے والی آہنی چادر کی طرف تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا سینکڑوں میل کا سفر کر کے آیا ہوں۔ اُٹھنے کی کوشش کی۔ ناممکن۔ ٹانگیں میرے نیچے دُہری تھیں اور بیکار۔ سوچا۔ گرنے سے کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہو گی۔ پر کسی قسم کا درد محسوس نہ ہو رہا تھا۔ اُٹھنے میں ہاتھوں کا سہارا لینا چاہا۔۔۔ پر میرے بازو دونوں پہلوؤں پر ناکارہ ہو کر لٹک رہے تھے۔

"بس اس حالت میں پڑا تھا۔ اور اس احساس سے مبہوت تھا۔ کہ میرے بازو اور میری ٹانگیں میری نہیں رہیں۔ مجھے ان پر کچھ قابو حاصل نہیں ہے۔۔۔ وہ میری اطاعت سے انکار کرتی ہیں۔۔

ان میں جان بس اسی طرح ہے۔ جیسے میرے کپڑوں میں ہے۔ جو ہوا کے جھکڑ میں اڑے جا رہے ہیں۔ کوئی طاقت جسے سمجھ نہ سکتا تھا۔ کہ کیا ہے مجھے آنکھیں نہ کھولنے دیتی تھی۔

ہم پوری رفتار پر اُڑے چلے جا رہے

تھے۔ طوفان بدستور تھا۔ مگر اس کے خروش کا وہ عالم نہ تھا۔ اور معلوم بھی کسی قدر فاصلے پر ہوتا تھا بارش شروع ہو گئی۔ فولاد پر اس کے پڑاپڑ برسنے کی آواز آرہی تھی۔ اور مجھے اپنے چہرے پر گرم گرم بوندیں بہتی معلوم ہو رہی تھیں ؛

"یک لخت مجھ میں جیسے کوئی چیز زرم پڑگئی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ میں پھر ٹھیک ہو گیا ہوں۔ بالکل ٹھیک۔ بس ایک ذرا تھکا ہوا ہوں اب مجھے یاد آیا۔ میں کہاں ہوں۔ اور میرا کام کیا ہے۔ اس خیال نے ایک جھٹکا سا لگا کر مجھے پھر گرد و پیش سے خبردار کر دیا۔ پر اب تک نہ سمجھا تھا۔ کیا ہوا ہے۔ کیوں میری حالت ایسی ہے۔ جیسے مفلوج ہو گیا ہوں۔ میں نے آگ دہکانے والے کو آواز دی۔ کہ اٹھنے میں مجھے سہارا دے

"کوئی جواب نہ ملا ؛

"انجن پوری رفتار پر جا رہا ہو۔ تو اس کا شور

بہرا بنا دیتا ہے۔ چنانچہ میں نے اَور زور سے آواز دی:

"فرانسواز! او فرانسواز! ذرا اپنے ہاتھ سے سہارا دینا"

"پھر کوئی جواب نہ ملا۔ اب تو ایک بڑے بھیانک خوف نے مجھے جکڑ لیا۔ کس شئے کا خوف؟ میں نہ جانتا تھا۔ پر اس کے زبردست احساس سے تڑپ کر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور زور سے ایک چیخ ماری۔ ہیبت کی چیخ۔ جو اس وقت کسی طرح بھی ناجائز نہیں کہی جا سکتی"

"انجن خالی تھا۔ آگ دہکانے والا غائب ہو چکا تھا۔ پلک جھپکنے میں میں واضح طور پر سمجھ گیا۔ کہ کیا ہو گیا ہے۔ ہم پر بجلی گری تھی۔ آگ دہکانے والا اس سے مر گیا۔ اور باہر لائن پر گر پڑا۔ اور میں ... میں مفلوج ہو چکا ہوں"

"نہ صاحب۔ اگر میں بڑا عالم ہوتا۔ اور پوری

محنت سے لفظوں کی تلاش کرتا۔ پھر بھی آپ پر ظاہر نہ کر سکتا۔ کہ اس وقت دہشت کے مارے میری کیا حالت تھی۔ جو رفیق میرے پہلو میں ہونا چاہیئے تھا۔ کہ میری امداد کرے۔ جیسے کسی سحر سے غائب ہو چکا تھا۔ اور میرے پیچھے دو سو مسافر پڑے سو رہے تھے۔ یا مزے میں باتیں کر رہے تھے۔ او انہیں گمان تک نہ تھا۔ کہ ایک سیلاب کی طرح دیوانہ وار یقینی موت کے منہ میں اڑے چلے جا رہے ہیں۔ جو شخص ٹرین کا ذمہ دار تھا۔ وہ بھی ایک بے دست و پا ڈھیر تھا۔ ہاتھ تک نہ اٹھا سکتا تھا۔ مفلوج ہو چکا تھا۔ . . اپاہج تھا . . . یہ تھی میری کیفیت . . . .

"میرا جسم جس قدر معطل تھا۔ دماغ اسی قدر مصروف کار ہو رہا تھا۔ پہلے میں نے صاف صاف طور پر دیکھا۔ کہ لائن سامنے دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ پٹڑی کا لوہا چاند کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ

کر رہا تھا۔ ہم سرپٹ چلے جا رہے تھے . . . جیسے کسی بندش سے چھوٹ کر اُڑے جا رہے ہوں!

. . . عادت مجھے رفتار کے احساس سے بے حس بنا چکی تھی۔ پر اب مجھے پھر اس کا احساس ہونے لگا۔ ٹرین بجلی کی چمک کی طرح ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے سامنے سے گذر گئی۔ اتنی تیز نہ تھی۔ کہ میں کچھ بھی نہ دیکھ سکتا۔ میں نے دیکھ لیا۔ کہ تار برقی کے آلے کے قریب سگنل دینے والا اپنی جگہ پر بیٹھا اُونگھ رہا ہے۔ پٹڑی بدلنے سے گاڑی کو ایک دو ہچکولے لگے۔ پلیٹیں کھڑکیں۔ پٹڑیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گذرتی تھیں۔ ان میں سے معینہ لائن ایک سخت بڑی دکھائی دی۔ پھر چھوٹی نظر آنے لگی . . . گاڑی فوراً مڑ گئی۔ اور ایک بار پھر تاریکی میں دیرانہ گھستی چلی گئی۔

"آگے سرنگ آ گئی۔ اور ہم گرجتے برستے طوفان کی طرح اس میں گھس گئے . . . آگے پھر

کھلی لائن تھی۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ ہم کہاں ہیں۔ میں نے جی ہی جی میں کہا۔ ناممکن ہے۔ کہ ہم پٹڑی پر سے نیچے نہ اتر جائیں۔ دو منٹ کے بعد ہم ایک ایسے مقام پر پہنچیں گے۔ جہاں پٹڑی یک لخت ایک طرف کو مڑ جاتی ہے۔ اور جس رفتار سے ہم سفر کر رہے ہیں اس کے لحاظ سے یقینی ہے۔ کہ ہم پٹڑی پر سے اچھل پڑیں . . .

"لیکن مشیت ایزدی نہ تھی! انجن اور کل ٹرین ایک طرف کو جھک گئی . . . پٹڑی پہیوں کے نیچے جیسے پس کر رہ گئی . . . اور ہم گذر گئے . . .

"اس موڑ کے متعلق مجھے سب سے زیادہ خطرہ تھا۔ یہاں سے گذر کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ سوچا۔ ایندھن ختم ہونے سے شاید آگ بجھ جائے . . . انجن تھم جائے . . . گارڈ جلدی سے ٹرین کے سامنے آجائے گا . . . میں اسے بتا دوں گا۔

کیا واقعہ ہُوا ہے . . . وہ ہمارے سامنے اور پیچھے خطرے کے نشان لگا دے گا۔ ہم بچ جائیں گے . . .

"لیکن مجھے یہ اطمینان زیادہ دیر تک نہ رہا۔ اُسی وقت ہم اُڑتے ہوئے ایک اسٹیشن کے سامنے سے گذرے۔ وہاں میں نے ایک ایسی چیز دیکھی۔ جس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سگنل ہمارے موافق نہ تھا۔ جس حصّے میں ہم داخل ہو رہے تھے۔ اس پر پٹڑی رُکی ہوئی تھی . . .

"سمجھ میں نہیں آتا۔ اس وقت میرا دماغ چل کیوں نہ نکلا۔ سوچیئے تو ایک انجن ستّر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑا ہوا جا رہا ہو۔ اشارہ مل چکا ہو۔ کہ آگے راستہ رُکا ہُوا ہے۔ تو ایسی حالت میں ایک شخص کے دماغ میں کیا کچھ خیالات گذر سکتے ہیں۔

"میں نے اپنے آپ سے کہا: تم تھم نہ

گئے۔ تو خود تمہارے اور تمہارے ساتھ تمام ٹرین کے پرخچے اُڑ جائیں گے . . . اس خوفناک حادثے سے بچنے کے لئے صرف ذرا سی حرکت کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف اتنی سیدھی سی حرکت۔ کہ جو لیور تم سے دو فٹ کے فاصلے پر ہے۔ اُس کو پکڑ لو . . . لیکن تم اتنی حرکت نہ کر سکو گے . . . نہیں کر سکتے . . . تم تمام واقعہ کو اپنی آنکھوں عمل میں آتا دیکھو گے۔ موت سے بھی سَو گنا زیادہ کرب محسوس کرو گے۔ کہ جس چیز سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہونا ہے۔ اسے اپنے سامنے دیکھو۔ اور دیکھتے رہو کہ وہ کیونکر بڑی ہوتی جاتی ہے . . . اور تم کس طرح دوڑ کر اس سے جا ٹکراتے ہو . . .

"میں نے چاہا۔ کہ آنکھیں بند کر لوں . . . نہ کر سکا۔ نہ چاہتا تھا۔ پر دیکھے جا رہا تھا۔ دیکھے جا رہا تھا . . . اور میں نے دیکھا۔ صاحب میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ رکاوٹ کے سامنے

آنے سے پیشتر ہی میں نے بُوجھ لیا تھا۔ کہ کیا چیز ہو گی۔ ذرا سی دیر میں اس کے متعلق کوئی شک شبہ نہ رہا۔ ۔ ۔ سامنے ایک بگڑی ہوئی ٹرین کھڑی تھی جس نے ہمارا راستہ روک رکھا تھا۔ مجھے اس کا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ پیچھے کی روشنی نظر آرہی تھی۔ نزدیک ہوتی گئی ۔ ۔ ۔ اور نزدیک ہو گئی۔ نہ جانے میں کیوں چیخیں مار رہا تھا۔ کیوں کہہ رہا تھا۔ آنا! روکنا! ۔ ۔ ۔ شنوائی نہ ہو سکتی تھی۔ خطرہ سر پر چڑھا آرہا تھا۔ سر کے سوا میرا باقی سب کچھ مردہ تھا۔ یا آنکھوں کی مہیب قوت کے باعث جو رات کی کاجل سی تاریکی میں بھی سب کچھ دیکھ سکتی تھیں۔ سر میں جان معلوم ہوتی تھی۔ یا کانوں کی قوت کی وجہ سے جو پہیوں کی گڑگڑاہٹ میں بھی سب کچھ سُن سکتے تھے۔ اور پھر یا ایک مجنونانہ قوت ارادی کے باعث جو برابر اس طرح مجھے احکام دیئے جا رہی تھی۔ جیسے کوئی افسر اُن رنگروٹ سپاہیوں کو

حکم دیتا ہے جنہیں مرتب کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"خطرہ سر پر چڑھا چلا آ رہا تھا . . . صرف پانچ سو گز دُور رہ گیا . . . صرف تین سو گز دور . . . لائن پر سائے سے ناچتے پھر رہے تھے . . . صرف ایک سو گز . . . بس ایک سو گز . . . ایک چمک . . . انجام۔ آخری گڑگڑاہٹ . . . مُردوں کا ڈھیر . . . فنا!

"حضور جن لوگوں نے یہ واقعہ دیکھا نہیں . . .

" . . . مجھے پھر ہوش آیا۔ تو مَیں تباہی اور بربادی کے ایک تودے کے نیچے دبا پڑا تھا۔ استمداد کے لئے ہر طرف کرب کی آوازیں بلند تھیں۔ مجھے نظر آ رہا تھا۔ کہ میدان میں کچھ لوگ لالٹینیں اُٹھائے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ بعض نے زخمیوں کو گود میں اُٹھا رکھا ہے . . . اور چیخیں ہیں . . . اور دکھ کی آہیں . . . اور نالہ و بُکا . . .

"مَیں دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ سُن رہا تھا۔ اور

مجھے کچھ پرواہ نہ تھی۔ اب میں کچھ نہ سوچ رہا تھا۔ مدد کے لئے کسی کو نہ پکار رہا تھا . . .

"میرے سر پر دو لکڑیاں ایک دوسرے کے اوپر پڑی تھیں۔ مجھ سے اتنی نزدیک تھیں۔ کہ میرے ہونٹ انہیں چھو سکتے تھے۔ اُن میں سے ذرا سا آسمان سُہانا سُہانا اور اُجلا اُجلا نظر آ رہا تھا۔ اور میں اسی طرح پڑا پڑا ایک ننھے مُنّے اور پیارے پیارے تارے کی دمک کو تک رہا تھا۔ جو آسمان پر کانپ رہا تھا . . . اس سے میرا جی بہل رہا تھا . . ."

سید حمید علی نے امرت الیکٹرک پریس ریلوے روڈ لاہور میں باہتمام دھرم چند بھارگو بی، ایس،
سی چھپوا کر دار الاشاعت پنجاب ریلوے روڈ لاہور سے شائع کی۔